جلد ۹۷
مارچ ۱۹۸۲ء
عدد ۱

ماهنامه

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ہماری نئی مطبوعات

مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شہرۂ آفاق تفسیر تفہیم القرآن

کا اسپیشل سیٹ اور ترجمہ قرآن مجید کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے

اس کے علاوہ ادارہ ترجمان القرآن کی نئی کتابیں

- مولانا مودودی کے سیاسی افکار — از عبدالکریم عابد
- دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ — از سید ابوالاعلیٰ مودودی
- سفینۂ نجات — از جمیل احسن ندوی
- تحریک اسلامی کے ماخذ — از سید اسعد گیلانی

طبع ہو کر جلد آنیوالی ہیں

پہلی بار تفہیم القرآن آفسٹ کاغذ پر شائع کیا جا رہا ہے

خوبصورت لیدر بائنڈنگ اور خوشنما چھپائی۔

اس کے لیے اپنا آرڈر بک کرائیں:

ادارہ ترجمان القرآن 5-A ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۷	مارچ ۱۹۸۲ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۴۰۲ھ	عدد ۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ———— ۴۱۰۳۱۶

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مُدّت کے بعد پھر کچھ دل کی باتیں!

کسی مجبورانہ صورتِ حالات میں جب اجتماعیت کے تحت کام کرنے والوں کا نظم معطل ہوجاتا ہے تو یہ بڑی سخت آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے۔ یعنی آدمی کو اپنے موقف پر قائم اور محورِ کار پر رکھنے اور ایمان و اخلاق کا معیار برقرار رکھنے کے لیے خارج سے جو سہارے ملتے ہیں وہ زیادہ تر ختم ہوجاتے ہیں، تب اصل دار و مدار اپنے ہی ایمان و شعور کی داخلی قوت پر ہوتا ہے۔ جو لوگ ہجوم میں چلنے اور دوسروں کے ریلوں کے بل پر حرکت کرنے کے عادی ہوتے ہیں، اُن کی ساری گرما گرمی ختم ہوجاتی ہے، جو لوگ ہر اقدام کے لیے اُوپر کے احکام کے منت کش ہوتے ہیں اُن کے قدم رُک جاتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ دعوتِ دین، تعمیرِ اخلاق اور خدمتِ معاشرہ کو سیاست کے تابع کر لیتے ہیں وہ کسی غیر سیاسی دَور میں داخل ہونے کے بعد اپنے آپ کو خلاء میں محسوس کرتے ہیں کہ بس اب کام کرنے کا کوئی راستہ باقی نہیں ہے۔

اگر آپ داعیِ حق ہیں تو کسی کے جھنجھوڑنے کا انتظار کیے بغیر جاگ اُٹھیے، دوسروں کی مشعلیں مدد نہیں کر رہیں تو اپنے اندر کے دیئے کو اکسائیں، کوئی صدائے جرس نہیں آتی تو اپنے دل کی دھڑکنوں کی آواز سے گامزن ہوجائیں۔

نہ بھولیے کہ آپ شہداء علی الناس میں سے ہیں جنہیں خدا نے چُن لیا اور جو خدا کے

رسول کے سکھائے ہوئے پیغام کو پھیلانے پر مامور ہیں۔ "ھُوَ اجْتَبٰکُمْ" (الحج — ۷۸) اور "وَیَتَّخِذَ مِنْکُمْ شُھَدَاءَ" (آل عمران — ۱۴۰) کے کلمات سے اللہ تعالیٰ نے جو منصب اور رتبہ آپ کو دیا ہے، اُسے سمجھنے اور اُس کی ذمہ داریاں پوری کرنے میں کسی لمحے بھی غافل نہ ہوں۔ اپنے آپ کو اس بدبختی سے بچایئے کہ جس طرح آپ کو چن لیا گیا ہے، اُسی طرح نااہلی کی وجہ سے ٹھکرا دیا جائے۔ عہدہ نہ ملنا کم خرابی کی بات ہے لیکن عہدے سے نااہلی کی بنا پر ڈسمِس کر دیا جانا بڑی تباہی ہے۔

جو لوگ ایمان سے محروم ہیں اُن کو حالتِ ایمان تک لانا اور جن کے ایمان خوابیدہ ہیں اُن کے ایمانوں کو بیدار کرنا اور جہاں کہیں ایمان اور عمل میں فاصلے اور تضادات ہوں اُن کو دُور کرنا آپ کی اوّلین ذمہ داری ہے، بلکہ فی الحقیقت یہی ایک ذمہ داری ہے۔ کسی معاشرے کے جس قدر افراد میں بھی ایمان اپنا صحیح کام کرنے لگتا ہے اُن کو ایمانی سیاست کا راستہ بھی از خود مل جاتا ہے اور باقی تمام دائروں میں بھی ہدایت مل جاتی ہے۔ اگر کسی شخص میں توحید و رسالت کے صحیح شعور کے ساتھ ایمان کام کرنے لگے تو یوں سمجھیے کہ اسلامی سیاست اور تحریکِ اقامتِ دین کا مجاہد کارکن بھی پیدا ہو گیا۔

پس خادمانِ اسلام کا اوّلین اور اہم ترین کام خواص و عوام کو خدا پرستی اور پابندیٔ دین کی دعوت دینا ہے۔ یہ کام اتنا بنیادی اور اتنا اہم ہے کہ یہ ہر قسم کے حالات میں جاری رہتا ہے۔ آپ جیل میں ہوں تب بھی، اور اقتدار کے تخت پر ہوں تب بھی، آپ بے بسی کے عالم میں ظالموں کے ہاتھوں اذیتیں بھگت رہے ہوں تب بھی، اور تلوار کا مقابلہ تلوار سے کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں ہوں تب بھی، آپ خواہ ایک بے پایاں ہجوم کے درمیان گھرے ہوں، خواہ تن تنہا ہوں، وسائل رکھتے ہوں یا بے وسیلہ ہوں، خوش حال طبقوں تک رسائی رکھتے ہوں یا غریبوں سے میل جول ہو، آپ کی تعلیم اعلیٰ درجے کی ہو یا نہ ہو، آپ استاد ہوں یا طالب علم اور آپ اجیر ہوں یا مستاجر، ہر قسم کے حالات میں فریضۂ دعوت برقرار رہے گا۔ آپ تعلیم و تلقین کی حدود میں ہوں، یا خدمت کے دائرے میں، انتخابی کشمکش میں شریک ہوتے ہوں یا ابھی نہ ہوئے ہوں، شریک ہو کر جیتنے کے حالات رکھتے ہوں یا شکست کے امکانات، آپ اپوزیشن میں بیٹھے ہوں یا وزارت میں آئیں۔ حالات کی کوئی بھی شکل ایسی نہیں کہ اساسی دعوتِ دین کا فریضہ معطل ہو جائے یا ثانوی و ضمنی اہمیت حاصل کر جائے۔

جس طرح جہاد نہ اس صورت میں رکتا ہے کہ کوئی ظالم قوت غالب ہو اور نہ اس صورت میں کہ اقتدار اربابِ عدل کے ہاتھ میں ہو، اسی طرح دعوتِ دین کا کام کسی بھی صورتِ حالات میں نہیں رکتا ۔ وہ تعلیم کے دائرے میں، علوم و فنون کے دائرے، ادب و صحافت کے دائرے میں، قانون و انتظام کے دائرے میں، اور معیشت و معاشرت کے دائرے میں جاری رہے گا۔ اسے امرا اور غربا میں، شہریوں اور دیہاتیوں میں، مردوں اور عورتوں میں، ایک زبان اور دوسری زبان میں۔ ایک قسم کے ذرائع سے اور دوسری قسم کے وسائل سے لے کے چلنا لازم ہے۔

یہ کام کسی خاص طرز کے حالات سے مشروط نہیں، کسی امتیازی قسم کے وسائل پر موقوف نہیں، اس کا کوئی خاص سیزن یا موسم نہیں، اس میں کوئی تعطل یا تعطیل نہیں، یہ ڈیوٹی عمر بھر کی ڈیوٹی ہے، سال بھر کے بارہ مہینوں، ہفتے کے سات دنوں اور ہر دن کے چوبیس گھنٹوں میں اس کو جاری رہنا ہے۔

بعض حضرات اس لیے سکڑے بیٹھے رہتے ہیں کہ انہیں میدانِ کار نہیں ملتا۔ حالانکہ اولین میدانِ کار تو آدمی کا خود اپنا نفس ہے، جو اپنی خواہشوں اور مفاد کی سلطنت کے بڑے حصے کو دعوتِ دین کی زد سے بچا کے رکھنے کے لیے ہر قسم کے حیلوں اور دلائل کے اسلحہ سے لڑتا ہے، اور ایک بار اگر مفتوح ہوتا بھی ہے تو ازسرِنو کسی گوشے سے اپنی لڑائی شروع کر دیتا ہے۔ اسی کے متعلق تو حضورؐ نے فرمایا تھا کہ اصل پہلوان وہ ہے جس نے اپنے نفس کو پچھاڑ لیا، نیز تربیتِ نفس کی لمبی مہم کو جہادِ اکبر سے تعبیر کیا۔ نفس کی سرکش اور دسیسہ کار قوتوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لیے گھات لگا کر بیٹھنا اور عمر بھر پہرہ دینا کوئی کھیل نہیں ہے۔ میرے سامنے روائتی تصوّف کا فلسفہ نہیں، رسولِ خدا کا سکھایا ہوا حقیقی تصوّف ہے، جس کے لیے آپ کو خدا نے مزکّی بنایا۔

دوسرا قریب ترین میدانِ کار کسی قریب ترین شاہدِ حق اور نقیبِ دین کا اپنا گھر ہے۔ معاشرے کی ایک تنظیمی اکائی جو اگر نیکی کا سرچشمہ بن جائے تو سینکڑوں کے لیے باعثِ فیض۔ برائی کا اڈہ بن جائے تو ہزاروں کے لیے وجہِ وبال، اور لامقصدیت کا آئینہ دار ہو تو بے شمار لوگوں کے لیے

ذریعۂ جمود و تضاد! ذرا غور سے جائزہ لیجیے کہ اس میں آپ نے دعوتِ اسلامی کا کام پچھلے کئی سالوں میں کہاں تک کیا ہے اور کیا اس کے ثمرات اطمینان بخش ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کی غفلتوں کی وجہ سے آپ کے گھر ہی میں اپوزیشن کا مضبوط محاذ کھل گیا ہو؟ دعوت کے لحاظ سے معیاری گھر صرف وہ گھر ہیں جن کے مرد مردوں میں، عورتیں عورتوں میں، لڑکے لڑکوں میں، لڑکیاں لڑکیوں میں کام کر رہی ہوں۔ اور ہر فرد یہ محسوس کرے کہ دعوتِ حق کی مہم میں اسے پورے گھر کا تعاون حاصل ہے۔

پھر آگے چلیں تو آپ کا اڑوس پڑوس ہے، آپ کے اقربا ہیں۔ آپ کے دفتری اور کاروباری ساتھی ہیں، آپ بازاروں میں، ہوٹلوں میں، بسوں میں جگہ جگہ لوگوں سے ملتے ہیں اور ان سے باتیں کرتے ہیں۔ کوشش یہ کیجیے کہ جہاں بھی خوبصورتی سے ممکن ہو، اصل بات کے لیے راستہ نکالا جائے۔ کسی کو گھر پہ مدعو کیجیے، کسی کے گھر خود جائیے، اضطراب کے مارے ہوئے انسانوں کو سمجھائیے کہ راہ نجات صرف خدا پرستی ہے، مسائل سے بے بس کر مایوس ہونے والوں کو توجہ دلائیے کہ خدا کا دین سب سے بڑا سرمایۂ امید اور ذریعۂ حلِ مسائل ہے۔ خود پرستی کے مارے ہوئے ملول افراد کو اس نسخۂ شفا کا پتہ دیجیے کہ دوسروں کی خدمت کر کے ہی آدمی مسرت حاصل کر سکتا ہے اور دوسروں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہیں سچائی کا راستہ دکھایا جائے۔

کوئی تبدیلی چاہے انقلاب کے راستے سے آئے یا انتخاب کے راستے سے، اس کی شرط لازم یہ ہے کہ اس تبدیلی کے آرزومند اور اس کے ذریعے برپا ہونے والے نظام کے شیدائی کسی معاشرے میں مناسب تعداد میں ہوں۔ یعنی ایک طرف تبدیلی کی لہروں کو انضباط میں رکھنے کے لیے اور دوسری طرف نظامِ مطلوب کو چلانے کے لیے لازمی قوت ضرور سمٹ آئی ہو۔ ورنہ جس نظام یا تبدیلی کی دعوت ہی کماحقہٗ نہ پھیلائی جا سکی ہو اس کے نعرے سے اتفاقی طور پہ انقلاب برپا ہو جائے تو اس انقلاب کی باگ ڈور کوئی اور سنبھالے گا۔ اسی طرح اگر انتخاب واقع ہو تو ووٹروں ہی کی اتنی تعداد نہ ہوگی جو ایمان اور فکر و شعور کی روشنی میں صحیح اور موزوں افرادِ کار کو نمائندگی پہ لا سکیں۔ انتخابی سیاست کا وقتی ریلا کچھ تھوڑے سے جذباتی عناصر کو ساتھ بہا لیتا ہے، لیکن اصل دارومدار مضبوط ذہن و کردار کے ٹھوس افراد کی قوت پر ہوتا ہے۔ پس سیاست کی جنگ جیتنے کے لیے بھی شدید ضرورت

توسیعِ دعوت کی ہے۔

اگر کچھ اچھے لوگ اس انتظار میں بیٹھے رہیں کہ جب سیاسی پابندیاں ختم ہوں گی تو اُس وقت جلسوں اور تقریروں سے کام کریں گے، تو یہ انتظار وقت کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہے۔ موجودہ غیر سیاسی دَور کوئی پسندیدہ حالت نہیں ہے، مگر جلسے جلوس کے سہارے قائم رہنے والے گروہوں کے مقابلے میں شہداء علی الناس کے لیے ایک وجہ سے یہ ایک قیمتی مہلت بھی ہے۔ اِس وقت فضا ہر قسم کے ہنگاموں سے خالی ہے، کوئی شور شرابا نہیں۔ ذہنوں میں طوفانی مدوجزر نہیں، انفرادی دعوت کے لیے میدان چوپٹ کھُلا ہے۔ اگر اس مہلت میں صحیح کام ہوا ہو تو اُس کے گزرنے کے بعد روشنی ہونے پر آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ آپ کی قوت پہلے سے دس گنا بڑھ چکی ہے۔ لیکن اگر کماحقہ کام نہ ہو سکا تو آپ اپنے آپ کو اسی جگہ پائیں گے جہاں اِس دَور سے پہلے تھے۔ پھر اگر جمہوریت کی بند سڑک کھُل گئی اور انتخابات کی منادی ہو بھی گئی تو آپ کیا نئی توقعات کریں گے۔

مجھے اندازہ ہے کہ دعوت کا کام پوری طرح معطل نہیں ہوا ہو گا اور جتنا کچھ ہوا ہے اُس کی برکات سامنے آجائیں گی، مگر میں یہی اندیشہ کرتا ہوں کہ جتنا اور جو کچھ ہونا چاہیے، وہ بمشکل ہی ہو سکا ہو گا۔ اندریں صورت یہی کہا جا سکتا ہے کہ پہلے اگر کوئی کسر رہی ہو تو اب جو مہلت باقی ہے، اس میں پوری قوت سے ہر فرد اپنی بساط کے مطابق تلافی کرے۔

بعض دوست یہ اشکال بھی پیش کرتے ہیں کہ وہ اگر کسی سے ملتے ہیں اور بات کرتے ہیں تو اصل بات دوسروں کی طرف سے چھڑتی ہی حکومت اور ملکی مسائل کی ہے۔ گرانی کے نوحے، جرائم کی فریادیں، فحاشی کا ردّعمل اور اسی طرح کی چیزیں زیر بحث آتی ہیں۔ دعوت الی اللہ کا تو راستہ کم ہی ملتا ہے۔

ایسے موقع کے لیے دو طریقے ہیں: ایک یہ کہ آپ دوسروں کو اپنی ساری باتیں کھُل کر کہنے دیں اور جب اندازہ ہو کہ اُن کے اندر کا دھواں بیشتر نکل چکا ہے تو پھر بات میں سے بات نکالتے ہوئے گفتگو کرنے والوں کو اس طرف توجہ دلائیں کہ معاشرے کی ساری خرابیوں کی جڑ کیا ہے اور افراد

کے کردار کیوں مختل ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ شروع ہی میں یا آگے چل کر کسی بھی موقع پر ہم نشین کو یوں توجہ دلائی جائے کہ بھئی سیاسی اختلافات اور جھمیلے ایک طرف، ہماری ذاتی اور گھریلو زندگیوں میں سے بھی سکھ چین غائب ہے، ہم انسان ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے درندے بن گئے ہیں، ہم خدا پرست مسلمان ہوتے ہوئے خدا کے بندوں کے لیے باعثِ آزار ہیں، آپس میں لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی ہے۔ خیانت کا زور ہے، جبر کا دَور دَورہ ہے۔ خواہشوں کے جال میں ہم سب جکڑے ہوئے ہیں، آخر یہ حالات کیوں ہیں؟ کہاں سے یہ روگ شروع ہوتا ہے۔ یوں دلسوزی سے دعوت الی اللہ کا راستہ نکالا جاسکتا ہے۔

دعوت الی اللہ کے یہ معنی نہیں کہ بس کچھ عقیدوں اور اخلاقی باتوں کی تلقین کر کے قصہ ختم کر دینا ہے۔ جب خدا پرستی اور خدا کے دین کی ضرورت اور برکت واضح ہو جائے تو اگلا سبق یہ ہے کہ خدا ساری زندگی کا خدا اور اسلام ہر شعبہ حیات کے لیے واحد دین ہے۔ سیاست اور معیشت کے دائروں میں بھی ہمارا دین صرف اسلام ہے، کوئی دوسرا نہیں! پھر آپ اسلامی ریاست اور خدا پرست قیادت کا تصور بھی دلا سکتے ہیں اور تبدیلیٔ قیادت کی دعوت بھی دے سکتے ہیں۔

مگر یہ سارا کچھ کسی ایک ہی ملاقات یا ایک ہی نشست میں ہو جانے والا نہیں۔ جن لوگوں پہ کام کیا جائے۔ اُن سے بار بار ملا جائے اور دعوت کا ایک ایک سبق آہستہ آہستہ ودیعت کیا جائے۔ ہاں یہ ملحوظ رہے کہ مخاطب کی طرف سے محض گنبد کی صدا کی طرح "ہاں ہوں" ہی نہ ہوتی رہے۔ بلکہ اُس کی شخصیت کو آپ متحرک کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو آگے چلیں۔ کوئی آدمی اگر بالکل ٹھس ہی ملے تو اُسے چھوڑ دیں، جس کسی کے شعور میں حرکت آئے اُسے قدم بہ قدم آگے لے چلیں۔

دورانِ سفر کسی شخص سے اُمید افزا بات ہو تو اُس کا پتہ لے لیں، اُس سے بعد میں خط و کتابت کریں، ضرورت پڑے تو کبھی اُس کے مسکن تک جا پہنچیں۔ کبھی اُسے اپنے ہاں مدعو کریں۔ کبھی کوئی پڑھنے کی چیز اُسے مطالعہ کے لیے بھیج دیں، کبھی تحفہ کے طور پہ کسی درس یا تقریر کا کیسٹ اُسے پیش کر دیں۔

آدمی جب کچھ کرنے پہ آتا ہے تو نہ جانے کیا کیا کچھ کر سکتا ہے!

بعض دوستوں نے مجھ سے اکا دکا موقعوں پہ یہ سوال کیا کہ ہم اپنے دفتر میں دس یا پندرہ سال سے موجود ہیں۔ اپنی دانست میں اخلاقی طور پہ ہم نے کچھ نہ کچھ بہتر رویہ ہی اختیار کیے رکھا ہے۔ کبھی کبھار کوئی پڑھنے کی چیز بھی بعض دوستوں کو دی ہے، زبانی بات بھی کی ہے، مگر اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ بیکار رہا ہے۔ رشوت اور خیانت اور کام چوری کے عادیوں کی روش جوں کی توں ہے۔ دفتر کی مصروفیت میں اوّل تو کچھ زیادہ باتیں ہو ہی نہیں سکتیں، ہوں بھی تو سرسری۔ ایک فقرہ ہم نے کہہ دیا، دوسرا فقرہ جواباً دوسرے نے کہہ دیا۔

سوال کرنے والے دوستوں سے میں نے پوچھا کہ کیا کبھی ایسا کوئی تجربہ بھی آپ نے کیا ہے کہ اپنے ساتھیوں میں سے کسی شریف مزاج یا تیز طرار آدمی کو چھانٹ کر آپ نے دعوت دیں کہ عرصے سے میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کبھی میرے ہاں چلیں اور کھانا کھائیں یا چائے پئیں، مل بیٹھیں گے اور کچھ کہیں سنیں گے۔ دفتری رابطے کے پھیکے پن سے اکتا کر میں یہ خواہش کر رہا ہوں۔ یا بصورت دیگر یوں بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کسی دفتری ساتھی سے یہ درخواست کریں کہ دوست! کسی دن اجازت دو تو شام تمہارے ساتھ گزارنے کے لیے گھر پہ آؤں۔

یہ ہرگز ضروری نہیں کہ پہلی ہی ملاقات میں سب کچھ آر پار ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ دو ایک ملاقاتیں محض بے تکلفی اور ربط باہم پیدا کرنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں گزر جائیں۔ پھر کبھی دوسری متفرق باتوں کے ساتھ آپ اپنی دعوت کی ابتدائی بات بھی کریں۔ آگے چل کر مزید پیش قدمی کریں — بے تکلفی ہو جائے تو کبھی کسی حلقۂ درس یا کسی ادبی نشست یا مجلس تقریر میں ساتھ لے جائیں، نیز کبھی اپنے چند دوسرے دوستوں کے ساتھ جانے کی مجلس یا پکنک یا شب بیداری کا انتظام کر کے اس میں نئے دوستوں کو شریک کریں۔

اپنے دفتر یا کارخانے یا کسی ادارے کے ساتھیوں پہ نظر رکھیں، اگر کسی کے ہاں شادی، مرگ کا واقعہ ہو تو اس میں حصہ لیں، کسی کے ہاں بیماری کا دور ہو تو بیمار پرسی کے لیے جائیں، کسی کو کوئی خاص ایسا مسئلہ درپیش ہو جس کے حل کرانے میں آپ مدد دے سکتے ہوں تو ضرور دیں۔ اچھے انسانی رابطے اور خدمات دعوت کا راستہ بنانے میں مؤثر ہیں۔

کاش کہ اس قسم کے بہت سے تجربات ہمارے پاس ہوتے اور ان کی رپورٹیں (باقی بر صفحہ ۴۸)

رسول اکرمؐ کا معیارِ زندگی

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

رسولِ اکرمؐ نے ایک عظیم الشان انقلاب برپا فرمایا۔ ایک سلطنت اور حکومت قائم کی۔ ایک صالح ترین معاشرہ قائم فرمایا اور ایک نظامِ زندگی جاری کر دیا۔ یہ سب کچھ تئیس سال کی قلیل مدت میں ہو گیا۔ درحقیقت آپؐ اسلامی انقلاب کے کامیاب ترین داعی اور دنیا کا سب سے عظیم جامع اور پُرامن انقلاب برپا کرنے والے تھے۔ لیکن اتنا حیرت انگیز کارنامہ انجام دینے کے بعد ایک مملکت کے سربراہ ہوتے ہوئے آپؐ نے اپنے لیے رضاکارانہ طور پر جو معیارِ زندگی اختیار فرمایا۔ وہ بھی حیرت انگیز ہے۔ قیصرؔ کسریٰ کے دور میں رہتے ہوئے آپؐ کا جو معیارِ زندگی تھا آپ اس پر بھی ایک نظر ڈالیے۔

گھر کا ایک منظر حضرت عمرؓ حضورؐ کے رہائشی کمرے میں تشریف لے گئے تو انہوں نے وہاں دیکھا کہ:۔

"ایک طرف کھجور کی چٹائی پڑی تھی، ایک کونے میں تھوڑے سے جَو پڑے تھے دیوار پر ایک بکری کی کھال لٹک رہی تھی، حضورؐ کے جسم پر کھجور کی چٹائی کے نشان موجود تھے اور جسم مبارک پر ایک تہ بند اور معمولی چادر تھی"۔

حضورؐ کی محرمِ راز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کی زندگی کا ایک رُخ بیان کرتی ہیں:۔

"میں حضورؐ کے فاقہ کی حالت دیکھ کر رو پڑا کرتی اور اضطراب سے آپؐ کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتی جو فاقہ سے دب گیا تھا اور عرض کیا کرتی: "میری جان آپؐ پر قربان، خدا کے لیے دنیا میں سے اتنا تو قبول فرمالیجیے جو جسمانی قوت کو قائم رکھنے کے لیے کافی ہو"، تو آپؐ فرماتے:۔ "عائشہ! مجھے دنیا سے کیا کام، میرے بھائی اولوالعزم رسول تو اس

سے بھی سخت حالت پر صبر کیا کرتے تھے۔ اور وہ اسی چال پر چلے اور خدا کے سامنے گئے اور خدا نے اُن کو نوازا اور پورا بدلہ دیا۔ اب اگر میں آسودگی کی زندگی بسر کرتا ہوں تو مجھے شرم آتی ہے کہ کل میں اُن سے کم رہ جاؤں۔ دیکھو جو چیز مجھے سب سے زیادہ پیاری ہے وہ یہی ہے کہ میں اپنے بھائیوں (سابق انبیائے کرام علیہم السلام) سے جا ملوں"۔[۱]

رضاکارانہ فقرِ نبوی حضورؐ کی یہ عسرت بھری زندگی ایک اختیاری اور ارادی زندگی تھی۔ اس میں معاشی حالت کی خرابی، مالی مشکلات کی دشواری، افلاس کی زیادتی اور روپے پیسے کی کمی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ حضورؐ کی مدنی زندگی کا نقشہ تھا جب کہ آپ کی فوجیں دنیا کو فتح کرنے کے لیے ہر چہار طرف آگے بڑھ رہی تھیں۔ حضورؐ کے سفیر شاہانِ عالم کے درباروں میں رعب و دبدبے کے ساتھ اسلام قبول کرنے، اطاعت قبول کر کے خراج اطاعت یعنی جزیہ دینے یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جانے کے الٹی میٹم لے کر جا رہے تھے۔ اسلامی تحریک عرب کی سرحدات کو عبور کر کے روم و فارس کی سرحدات کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ اُس دور کی سب سے بڑی عظیم الشان سلطنتیں تھیں۔ خراج اور مالِ غنیمت مختلف فتوحات کے نتیجے میں مدینہ کے دار الخلافت کی طرف دریا کے دھارے کی طرح بہہ رہا تھا اور عسر کا دور ختم ہو کر یسر کا دور شروع ہو چکا تھا۔

فقر، تربیت کا حصہ حضورؐ اکرم ایک خوشحال گھرانے کے فرد تھے۔ بلاشبہ بچپن کے کچھ ایام انہوں نے والدین کی وفات کے سبب کچھ کچھ عسرت میں گزارے تھے۔ لیکن ان کے دادا عبدالمطلب کو اُن سے بے پناہ محبت تھی۔ لاڈ پیار میں وہ کسی ماں باپ والے بچے سے کم نہ تھے۔ جو ننھا بچہ بے تکلف دادا کی گدی پر چڑھ کر بیٹھ سکتا ہو، جب کہ اس وقت سردارِ قوم عبدالمطلب کی گدی پر چڑھ کر بیٹھنے کی کسی کو بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس سے دادا کی بے پناہ محبت کا کیا ٹھکانہ ہو سکتا ہے۔ کچھ دن آپؐ نے بکریاں بھی چرائیں جو قدرت کی طرف سے سنّتِ انبیاء ہے۔ جس سے انسان کی طبیعت صبر و تحمل، محنت و مشقت اور خاموشی و سکوت میں غور و فکر کی عادی ہو جاتی ہے۔ جب تک انسان آثارِ کائنات پر غور نہ کرے اور اس کی تخلیق کے بارے میں سوچ بچار نہ کرے۔ وہ ان حقائق تک

---

[۱] رحمۃ للعالمین جلد دوم ص ۳۵۷

نہیں پہنچ سکتا جن حقائق پر اس کائنات کی سرشت رکھی گئی ہے۔ غور و فکر کے بغیر انسان مالکِ کائنات تک نہیں پہنچ سکتا۔ آیاتِ الٰہی قدم قدم پر اپنے خالق کی طرف خاموش اشارے کرتی ہیں لیکن ان اشاروں کو سمجھنے کے لیے یک سو دل اور پُر سکون دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ چیز فطرت کی کھلی گود میں بکریوں کے ریوڑ کے پیچھے یا درختوں اور پہاڑیوں کے دامن میں انسان کو خوب حاصل ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس سوچ بچار کے نتیجے میں پہلے خود توحید کا راز پایا تھا اور پھر اللہ کی طرف سے ہدایت کا علم حاصل کیا تھا۔ حضورِ اکرمؐ ایک خوش حال اور کھاتے پیتے گھرانے کے فرد ہونے کے باوجود اِن حالات سے دوچار ہوئے، جن سے دوچار ہوئے بغیر آپ وہ ابتدائی اور فطری پیغمبرانہ تعلیم و تربیت حاصل نہ کر سکتے تھے جو مطلوب تھی۔ اس لیے آپ کو دادا کے انتقال کے بعد ایک ایسے چچا کی سرپرستی حاصل ہوئی، جو دیگر چچاؤں کے مقابلے میں مالی لحاظ سے کمتر تھا، لیکن جس کا دل رحم و محبت کا سرچشمہ اور جو اپنے پیارے یتیم بھتیجے کے لیے ہمہ پہلو شفقت و مرحمت کا مجسمہ تھا۔ ان ایام میں حضورؐ چند سال بکریاں چرا کر ایک طرف اپنے محترم چچا کی آمدنی میں اضافہ کا باعث ہوئے اور دوسری طرف آپؐ کو شہر کی متمدن سوسائٹی سے جو کفر و شرک میں ملوّث اور اخلاقی قدروں سے محرومی کے سبب بناؤ سے زیادہ بگاڑ کا باعث بنی ہوئی تھی، بچ کر فطرت کی گود میں رہنے کا موقع میسر آگیا۔ آپؐ دن بھر بکریاں چراتے، شہر سے باہر پہاڑیوں میں گھومتے اور رات کو ریوڑ لے کر واپس آتے تو تھک کر آرام فرماتے۔ اس طرح اس سنّتِ پیغمبرانہ نے آپؐ کو مکّہ کی مشرکانہ اور کافرانہ سوسائٹی کے مسموم ماحول سے بچا کر پوری طرح فطرتِ ابراہیمی کے مطابق پالا۔

تجارت اور ثروت

جب آپؐ ذرا بڑے ہوئے تو تجارت میں دلچسپی لینے لگے اور اپنے چچا کے ساتھ شام کی طرف تجارتی سفر میں بھی گئے۔ اس تجارتی تجربے اور شعور سے متاثر ہو کر مکہ کی نہایت مالدار اور صاحبِ ثروت خاتون خدیجہ الکبریٰؓ نے جو اپنے پاکیزہ کردار کے سبب طاہرہ کے نام سے موسوم تھی، آپؐ سے نفع کی شراکت کی بنیاد پر اپنے کاروبار کی کارمختاری کرنے کی درخواست کی، جسے آپؐ نے اپنے چچا سے مشورے کے بعد قبول کر لیا۔

حضورؐ شعور کی اوّلین عمر سے کما رہے تھے۔ محنت، دیانت، شرافت، مشقت، ذہانت اور اچھی شہرت جیسی صفات آپؐ کے پاس وافر تھیں۔ ان انسانی خصوصیات کے ساتھ انسان جس کاروبار

میں جلتے اُس میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ لڑکپن سے نکل کر نوجوانی کی بالکل ابتدائی عمر میں ہی حضورؐ اپنے چچا کے ساتھ کاروبار میں دلچسپی لیتے اور اُن کا ہاتھ بٹاتے چلے آرہے تھے۔ اس کے بعد چچا کے مشورے ہی سے حضرت خدیجہؓ طاہرہ کے کاروبار میں نگرانِ اعلیٰ اور شریکِ کار کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔ اس کاروبار میں دیانت اور امانت کا سکہ ایسا رواں ہوا کہ لوگوں کے درمیان آپؐ کے صادق اور امین ہونے کی شان اور زیادہ نمایاں ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ صادق اور امین کے خطاب جو آپؐ کو قوم نے دیے تھے، یہ کسی گمنامی میں تو نہیں دیے گئے تھے۔ بار بار کے معاملات دیکھ کر، برت کر، ان کی ساکھ اور دیانت کا بار بار تجربہ کر کے ہی دیے گئے ہوں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضورؐ کے مالی حالات مکہ میں بھی بے حد کشادہ تھے اور جب آپ کی شادی مکہ کی عظیم تاجر خاتون طاہرہ سے ہو گئی، پھر تو آپ دولت کی ریل پیل کے درمیان جا کھڑے ہوئے تھے۔ غرض مکہ کی دولت کا تجارتی دھارا آپ کے قدموں میں سے گزرتا تھا۔ جب آپؐ نے مکہ سے ہجرت کی، تب بھی آپؐ کے پاس مکہ کے مالدار افراد کی اتنی امانتیں پڑی ہوئی تھیں کہ انہیں لوٹانے اور تقسیم کرنے کے لیے باقاعدہ حضرت علیؓ کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی جو انہوں نے حسن و خوبی سے ادا کی۔ پھر جس جس شخص کی امانت اُسے اس حالت میں صحیح سالم ملی ہو گی کہ مکے سے جانے والا جو شخص اپنی قوم کے تشدد اور ظلم کی وجہ سے شہر چھوڑ کر چلا گیا ہے اس نے یہ امانت واپس کی ہے تو اُن کے دل اندر سے کتنے متاثر مرعوب اور مفتوح ہوئے ہوں گے۔

خوشحال ملک التجار

غرض یہ بات یقینی ہے کہ حضورؐ ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے بعثت اور اعلانِ نبوت تک مکہ میں ایک خوش حال زندگی گزاری تھی۔ آپ کے جگری دوست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے لوگ بھی مکہ کے خوش حال لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ مکہ سے مدینہ آنے کے بعد بلاشبہ کچھ ابتدائی ایام سختی اور تنگ دستی کے گزرے تھے جو ہجرت کا لقینی نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن حضورؐ نے جو عظیم الشان نظامِ اخوت قائم کیا تھا۔ اس نے تباہ حال مہاجروں کا مسئلہ ابتدا میں ہی فوری طور پر حل کر دیا تھا۔ چنانچہ مکہ کے تاجر پیشہ مہاجر لوگوں نے جلد مدینہ کے کاشت کاروں کی تجارتی منڈی میں اپنے پاؤں جما لیے۔ پھر ہجرت کے دوسرے سال کے نویں مہینے رمضان المبارک کی ۱۷ تاریخ کو وہ معرکۂ بدر پیش آیا جس نے ایک طرف اسلام کو قریش کی مدِ مقابل

قوت ثابت کر دیا تو دوسری طرف اسلام کو ایک ریاست اور مملکت کی حیثیت بھی دے دی۔ اب حضورؐ مدینہ کی جدید اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت رکھتے تھے اور آپؐ کی اس نبویؐ حیثیت میں ریاست کے تمام مناصب کے اختیارات بھی جمع تھے۔ آپؐ بیک وقت جدید ریاست کے سربراہ، قانون ساز، شارع، منصفِ اعلیٰ، فوجوں کے قائد اور عام مسلمانوں کے محبوب رہنما اور ہادی تھے۔ آپؐ نے مدینہ میں آنے کے بعد بہت سے سیاسی، تمدنی، معاشرتی اور اجتماعی اسباب کی بنا پر چند اور شادیاں بھی کیں اور سب ازواج کے لیے علیحدہ علیحدہ رہائش کا انتظام فرمایا۔ احکامِ قرآن کے ذریعے جنگوں میں مالِ غنیمت کو خدا اور اس کے رسول کا مال قرار دے کر اُسے ریاستی ملکیت قرار دیا جا چکا تھا۔ لیکن یہ مال حضورؐ کی صوابدید اور اجازت کے مطابق تمام کا تمام مجاہدین میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ خود حضورؐ کے اہلِ بیت کا حصّہ بھی اللہ تعالیٰ نے ان اموال میں ہی مقرر کر دیا تھا۔ اللہ کے نبی کی مقدس حیثیت میں آپ کے ساتھ گہری محبت رکھنے والے اہلِ ایمان مختلف ذاتی ہدیے بھی اپنے دل کی گہرائیوں سے اظہارِ محبّت و عقیدت کے طور پر کثرت سے بھیجتے رہتے تھے۔ جن کے بارے میں حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے فرمایا تھا کہ حضورؐ ہمیں اتنے ہدیے بھیجتے تھے کہ بعض اوقات ہم حضورؐ کے ارسال کردہ ہدیے ہی اپنی طرف سے ہدیے کے طور پر آپؐ کی خدمت میں ارسال کر دیتے تھے۔

مالی اور معاشی لحاظ سے یہ نقشہ کسی مجبور و فقیر انسان کا نہیں ہے جو بھوک کی کثرت، لباس کی بوسیدگی، سامان کی کمی، سرو سامانِ زندگی کی قلّت پر اس لیے مجبور ہو گیا ہو کہ قلّتِ معاش کے سبب اس کو ان پریشانیوں کے رفع کرنے اور اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کا سامان میسر نہیں ہوتا اور وہ اسبابِ زندگی کے لحاظ سے مسکین اور مال کی کمی کے سبب سے محتاج ہو۔ حضورؐ کی زندگی کا معاشی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو جو تصویر حضرت عمرؓ نے حضورؐ کے کمرے میں دیکھی اور جس کا تذکرہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے بیان فرمایا۔ وہ قلّتِ مال کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس کے پیچھے دُنیا سے استغنا، اس کی آسائشوں سے ارادی اجتناب، سرو سامانِ زندگی سے بامقصد گریز اور مالِ دُنیا سے بے اعتنائی نظر آتی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے یہ الفاظ بہت غور طلب ہیں کہ:۔

"میری جان آپؐ پر قربان، خدا کے لیے دُنیا میں سے اتنا تو قبول فرمالیجیے جو جسمانی قوّت کو قائم رکھنے کے لیے کافی ہو۔"

اور جواب میں آپؐ کا یہ ارشاد کہ :-

"عائشہؓ مجھے دُنیا سے کیا کام، میرے بھائی اولوالعزم رسول تو اس سے بھی بری سخت حالت پر صبر کیا کرتے تھے اور وہ اسی چال پر چلے اور خدا کے سامنے گئے اور خدا نے اُن کو نوازا، اب اگر میں آسودگی کی زندگی بسر کروں تو مجھے یہ بھی شرم آتی ہے کہ کل میں اُن سے کم رہ جاؤں — دیکھو جو چیز مجھے سب سے پیاری ہے وہ یہی ہے کہ میں اپنے بھائیوں سے جا ملوں"

مال و دولت سے استغناء اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضورِ اکرمؐ کا یہ مکالمہ صاف بتاتا ہے کہ اس حالت میں قلتِ معاش کا کوئی دخل نہ تھا۔ اور اس کا لفظ لفظ بتاتا ہے کہ آپؐ دُنیا کے سروسامان سے مکمل طور پر بے نیاز تھے۔ آپؐ کثرتِ سامان کو دُنیا میں ملوّث ہونا شمار کرتے تھے۔ جو اُن کے منصب سے فروتر مقام تھا۔ اشیاءِ دُنیا سے آپ مستغنی تھے۔ حضورؐ سے پہلے انبیاء کو بھی اللہ تعالیٰ نے جب کارِ نبوّت پر فائز کیا تو اُنھوں نے دُنیا میں ملوّث ہونے سے اجتناب کیا۔ وہ عمر بھر دُنیا سے اجتناب کی روش پر قائم رہے۔ حضورؐ آسودگی کی زندگی بالارادہ بسر نہ کرتے تھے۔ اس لیے کہ آپؐ کو اپنے بھائی انبیاء کے طریقے سے مختلف طریقہ اختیار کرنا پسند نہ تھا۔ آپؐ کو اللہ کی راہ میں ایثارِ نفس کے معاملے میں اپنے سابقہ بھائی رسولوں سے کم رہنا مطلوب نہ تھا۔ جو چیز آپؐ کو سب سے زیادہ پیاری تھی وہ دُنیا نہیں بلکہ اپنے سابق برادرانِ نبوّت کی روش اور اُن سے ملاقات تھی۔ حضورؐ کو دُنیا میں تادیر رہنے اور اُس کے سروسامان سے استفادہ کرنے کی بجائے اپنے بھائی انبیائے کرام سے جا ملنا ہر شئے سے زیادہ عزیز اور پیارا تھا۔ گویا سارے ہی انبیاء کا طریقہ مال سے استغنا رہا۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے اس ارشاد سے بات بہت صاف ہو جاتی ہے کہ :-

"میری جان آپؐ پر قربان، خدا کے لیے دُنیا میں سے اتنا تو قبول فرما لیجیے جو جسمانی قوت کو قائم رکھنے کے لیے کافی ہو"

گویا حضورؐ نے دُنیا اور اُس کے سروسامان کو خود دھتکار رکھا تھا اور مسئلہ مال کے حاصل نہ ہونے، میسّر نہ آنے، در تنگ دستی سے فاقہ مستی تک نوبت پہنچ جانے اور مالی تنگی کا نہیں تھا۔ بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ یہ آفتِ جان دُنیا حضورؐ کو کسی درجے میں بھی قبول نہ تھی۔ اس بات کی مزید وضاحت کے لیے وہ حدیث کافی ہے جس

ہیں نماز کے دوران حضورؐ نے کسی شے کو اسی طرح پیچھے دھکیلا تھا جیسے کسی سے بچنے کے لیے اُسے دھکیلا جاتا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے نماز کے بعد حضورؐ سے پوچھا تو حضورؐ نے فرمایا کہ دُنیا مجسم ہو کر میری طرف آئی تھی اور میں نے اُسے دھتکار دیا۔

یہ جو چولہے میں مہینوں آگ نہ جلنے اور صرف کھجور اور پانی پر مہینوں گزر بسر کرنے کا تذکرہ آتا ہے، یہ غربت، مسکنت، مالی مجبوری اور معاشی بدحالی کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ ترکِ سامانِ دُنیا اور اجتنابِ راحتِ دُنیا کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ خود اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی یہی روش اختیار کر لی تھی۔ حضرت ابن زبیرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں ایک لاکھ اشرفیاں بھجوائیں تو ایک نماز سے دوسری نماز کے آنے تک ام المومنینؓ نے ساری اشرفیاں فی سبیل اللہ مساکین میں تقسیم کر دیں جبکہ خود روزے سے تھیں۔ جب ملازمہ نے کہا کہ شام کو پکانے کے لیے بھی کوئی شے گھر میں موجود نہیں ہے تو صرف اتنا فرمایا کہ پہلے بتا دیا ہوتا۔ حضورؐ کی تربیت ہی یہ تھی کہ حُبِ دُنیا پیدا نہ ہو۔ مومن کے لیے حُب ایک ہی کافی ہے اور وہ حُبِ اللہ اور رسول کے سوا کسی دوسری شے کی جائز اور درست نہیں ہے۔ غرض حضور اکرمؐ کی یہ روش تمام تر اجتنابِ دُنیا پر مبنی تھی۔ اس لیے کہ جو شخص دُنیا کے پیچھے دوڑتا ہے، دُنیا اُس کے آگے دوڑتی ہے اور جو شخص دُنیا کے آگے دوڑتا ہے دُنیا اس کے پیچھے دوڑتی ہے اور مومن جسے اِس دُنیا کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے سامنے مغلوب کرنا ہے اگر وہ خود دُنیا سے مغلوب ہو جائے تو پھر غلبۂ دین کہاں اور کیسے ہوگا۔

مومن اور عیشِ دُنیا

چنانچہ جب حضرت عمر فاروقؓ نے حضورؐ کے کمرے کا مختصر سا سرو سامان دیکھ کر حسرت سے کہا تھا۔ "یا رسول اللہ قیصر و کسریٰ تو دُنیا کا عیش کریں اور آپ کی قیام گاہ یہ معمولی کھجور کی چٹائی ہے، جس سے بدن مبارک پر نشان پڑ گئے ہیں۔" تو حضورؐ نے اس بات کے جواب میں یہی فرمایا تھا کہ مجھے دُنیا سے کیا سروکار۔ حالانکہ حضرت عمر فاروقؓ حضورؐ کے سامنے دُنیا کی دیگر سلطنتوں کے سربراہوں کا اس منصب کی بنا پر تذکرہ کر رہے تھے جو حضورؐ کو بھی حاصل تھا۔ اور آپؐ سے صرف یہ عرض کر رہے تھے کہ ایسی صورت میں نہ سہی ویسا آرام و راحت کا سامان، لیکن سربراہِ مملکت کی حیثیت سے آخر کچھ تو ہونا چاہیے لیکن حضورؐ نے ان کی گزارش کا صاف نفی میں جواب دے کر ایسی کسی بات کا امکان ہی ختم فرما دیا۔

حضورؐ کا یہی وہ نمونہ تھا جس نے اسلامی انقلاب کے بعد اسلامی مملکت کے سربراہوں کے سامنے اسلامی ریاست کے سربراہ کا معیارِ زندگی متعین کر دیا۔ جس کے نتیجے میں یہ منصب اس معیار کے ساتھ قائم ہوا کہ اگر کسی سربراہ مملکت نے اپنے قلیل ترین معاوضے میں سے بھی محسوس کیا کہ کچھ بچایا جا سکتا ہے تو اسی قدر اپنے معاوضے سے کمی کر دی اور موقعہ آیا تو بیت المال سے لیا ہوا سارا معاوضہ بھی اپنی جائداد فروخت کر کے واپس کر دیا۔ یہی وہ نمونہ تھا جس کی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ جیسا متقی انسان تیار ہوا تھا، جس نے ایک طرف قیصر و کسریٰ کو ہلا کر رکھ دیا اور دوسری طرف اجتنابِ دنیا کی مثال قائم کر دی۔ وہ بیت المال کے اونٹوں کو خود مالش کرتے تھے۔ اور بیت المقدس کی فتح کی چابیاں لینے کے لیے جب پیوند لگے کپڑوں کے ساتھ گئے تو سفر میں غلام سے سواری کی باری مقرر کر لی تاکہ انسانی مساوات قائم رہے۔ یہی وہ نمونہ تھا جس نے حضرت عثمانؓ کو امت مسلمہ کے لیے اپنی ساری جائداد لٹا دینے پر آمادہ کر دیا تھا۔ یہی وہ نمونہ تھا جس نے حضرت علیؓ کو جَو کی روٹی کھانے، پیوند لگے کپڑے پہننے اور رات رات بھر جاگ کر اللہ کی عبادت کرنے کی تعلیم دی تھی۔

عسرت اور انقلاب

غرض حضورؐ کے دفتریں حکمتوں کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ انسان سازی، تعمیرِ اخلاق، اسوۂ حسنہ اور ایک نئے اصولی نظریاتی اور انقلابی ریاست کو پوری مخالف دنیا کے سامنے حسنِ کردار سے مزین کر کے پیش کر دینا معمولی معجزہ نہیں ہے۔ خوشحالی ہمیشہ انسانی قویٰ کے زوال و انحطاط کا موجب بنتی ہے۔ اور عسرت و تنگ دستی قویٰ کی مضبوطی، ہمت و شجاعت، محنت و مشقت اور انقلاب کی کھکیڑ سہنے کے لیے تیار کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ دنیا میں انقلابی تبدیلیاں خوشحال لوگوں کے ذریعے کبھی نہیں آئیں۔ سلطنتوں کے بانی، جفاکش، محنت پیشہ، عسرت پسند اور تنگ دست لوگ ہی ہوتے رہے ہیں۔ اور سلطنتوں کو ڈبونے والے ہمیشہ عیش و عشرت کے دلدادہ، آرام طلب، عیش کوش اور سہولت پسند لوگ ہوتے رہے ہیں۔ یہ وہ اصول ہے جو اس دنیا کے مادی اسباب میں فطری طور پر ہمیشہ سے جاری و ساری ہے۔

اسلامی انقلاب کا مزاج

حضورؐ نے اپنے اسلامی انقلاب کا مزاج سادہ، بے نیاز، متوکل، صابر، خدا ترس اور جفاکش بنایا۔ اس نظام کو ایک طرف دین و ایمان کے حسن و خوبی سے سجایا

گیا۔ اور دوسری طرف آپؐ نے خود اپنا نمونۂ فقر بھی پیش کیا تاکہ اسلامی انقلاب ان بنیادوں پر استوار ہو جو پائیدار ہیں۔ اور یہ بنیادیں اُسے زوال و انحطاط سے بچا سکیں۔ آپ جانتے تھے کہ اگر مسلمان دُنیا میں ضرورت سے زیادہ ملوّث ہوئے تو عیش و عشرت اور دُنیا طلبی کے باعث باہمی کشمکش کر کے تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اس لیے حضورؐ نے مسلمانوں کے زوال کا باعث دو چیزوں کو پیشگی طور پر ہی قرار دے دیا تھا۔

"میری اُمت پر وہ وقت آنے والا ہے جب دوسری اُمتیں اُس پر ٹوٹ پڑیں گی، جس طرح کھانے والے لوگ دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں تو کسی کہنے والے نے کہا کہ جس زمانے کا آپؐ حال بیان فرما رہے، کیا اُس زمانہ میں ہم مسلمان اتنی کم تعداد میں ہوں گے کہ ہم کو نگل لینے کے لیے قومیں متحد ہو کر ٹوٹ پڑیں گی؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں اس زمانہ میں تمہاری تعداد کم نہ ہوگی، بلکہ تم بہت بڑی تعداد میں ہو گے۔ لیکن تم سیلاب کے جھاگ کی طرح ہو جاؤ گے اور تمہارے دشمنوں کے سینے سے تمہاری ہیبت نکل جائے گی۔ اور تمہارے دلوں میں پست ہمتی گھر کر جائے گی۔ اس پر ایک آدمی نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسولؐ! یہ پست ہمتی کس وجہ سے آئے گی۔ آپؐ نے فرمایا۔ یہ اس وجہ سے ہو گی کہ تم آخرت سے محبت کرنے کے بجائے دُنیا سے محبت کرنے لگو گے اور خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو کی بجائے موت سے بھاگنے اور نفرت کرنے لگو گے"۔

(راہِ عمل)

اس بات کو حضورؐ نے دوسری جگہ اس طرح فرمایا:۔

"جو شخص دُنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کو ضرور تباہ کرے گا اور جس شخص کو اپنی آخرت محبوب ہوگی، وہ اپنی دُنیا کو نقصان پہنچائے گا۔ اے لوگو! تم باقی رہنے والی زندگی کو فنا ہو جانے والی زندگی پر ترجیح دو"۔

چنانچہ حضورؐ کے فقر کا راز یہی تھا کہ آپؐ نے باقی رہنے والی زندگی کو اپنی فنا ہونے والی زندگی پر مثالی طور پر ترجیح دے رکھی تھی اور یہی ترجیحِ آخرت آپ ہر مسلمان میں بھی پسند فرماتے تھے۔ اس لیے جہاں حضورؐ نے عبادات کے ذریعہ اسوۂ حسنہ پیش فرمایا۔ وہاں معاملات کے ذریعے

بھی اپنا اسوۂ حسنہ پیش فرمایا۔ آپ نے اسلامی انقلاب برپا کرکے اور اس کے مختلف مراحل سے گزر کر بھی اپنا اسوۂ حسنہ پیش فرمایا اور ایک دنیوی زندگی گزار کر بھی اپنا اسوۂ حسنہ پیش فرمایا۔ اس طرح وہ انقلاب پائیدار ہو گیا جو حضور نے اللہ کی تائید کے ساتھ اپنی حکمتِ دین، تدبیر سیاسی، جنگی حکمتِ عملی اور خدا ترسانہ پُرمشقت زندگی کا سرمایہ لگا کر برپا فرمایا تھا۔

غرض یہ بات اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ حضور کا فقر قلتِ مال و دولت اور عسرتِ سروسامان کا نہیں تھا۔ حضور تو ہزاروں اور لاکھوں لوگوں کو مالِ غنیمت فراخدلی کے ساتھ تقسیم فرماتے تھے۔ ایک ایک شخص کو اپنی عنایات سے لاد دیتے تھے۔ سیروں سونا اور منوں چاندی ایک نماز سے دوسری نماز کے درمیان لوگوں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ آپ کو روپے پیسے کی قلت کا کوئی مسئلہ نہ تھا، بلکہ آپ نے اپنے اسلامی انقلاب کا مزاج بھی یہ طے کیا تھا کہ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر خود پیاسے رہتے ہوئے ساری دنیا کو سیراب کرنا ہے۔ سیاسی انقلاب کا بھی وہ مزاج ہے جو اگر تم ہو تو وہ حقیقی اسلامی انقلاب ہے، ورنہ بادشاہتیں تو روز بدلتی رہتی ہیں۔ ایک بادشاہ کے مٹنے اور دوسرے بادشاہ کے آنے سے دنیا کے احوال میں نہ فرق آتا ہے اور نہ اس سے کوئی انقلاب برپا ہوتا ہے۔

(باقی)

حقیقتِ تصوّف

پروفیسر طیب شاہین لودھی صاحب

(۲)

تصوف یا تزکیۂ نفس

بہر حال حقیقی تصوّف محض صوف کا لباس پہننے، غیر ضروری جسمانی تعذیب، نفس کشی، ترک دنیا، ترکِ طیبات اور رہبانیت کا نام نہیں بلکہ بقول شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبداللہ انصاری ہرویؒ تمام اربابِ تزکیۂ نفس اس پہ متفق ہیں کہ تصوف خلق اور تہذیبِ نفس ہی کا نام ہے۔[1] اس بارے میں تمام اصحابِ تصوّف کی بات کا مفہوم ایک ہے یعنی بھلائی عام کرنا اور اذیت رسانی سے باز رہنا۔ بھلائی کو عام کرکے اور اذیت رسانی سے باز رہ کر ہی تصوّف کا ادراک ممکن ہے۔ تصوّف اور سلوکِ حقیقی دراصل تزکیۂ نفس ہی کا دوسرا نام ہے۔ تہذیب و تزکیہ کے بعد ہی نفس میں یہ استعداد پیدا ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے رفیقِ اعلیٰ اور محبوب کی صحبت اختیار کرسکے۔ تزکیۂ نفس دراصل جمعیتِ قلبی کی تیاری ہے تاکہ بندۂ مومن ہر ماسوا کو اپنے قلب سے نکال کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر رہے۔ ہر چیز سے بے خبر ہوکر صرف حق تعالیٰ ہی میں مشغول ہوجائے۔ قلب اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور اس کے اسماء و صفات کے شہود میں مرتکز ہوجائے یہی وہ مقام ہے جسے "احسان" کہا گیا ہے۔ تصوّفِ حقیقی یا سلوکِ محمدی اسی مقام پہ پہنچنے کا نام ہے۔ یہی حاصلِ عبودیت ہے، انبیائے کرام کے تزکیۂ نفس کا تمام تر مقصد یہی ہے کہ بندے کو یہ مقام "احسان" حاصل ہوجائے۔ سلوکِ محمدی میں سالک بتدریج مقام "اسلام" سے مقامِ "ایمان" میں اور مقامِ "ایمان" سے مقامِ "احسان" میں منتقل ہوتا ہے۔

[1] مدارج السالکین ۲ : ۳۱۶

سلوک اور سالک ہر عقیدہ کے اصحابِ تصوّف نے روحانی مدارج طے کرنے کو حسی سیر و سفر سے تشبیہ دی ہے۔ بندے میں جب حقیقت کی طلب بیدار ہوتی ہے تو وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اور منزل بہ منزل قیام کرتا ہوا اپنے مطلوب تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اصحابِ تصوّف کی اصطلاح میں اس سفر کو "سلوک" اور اس راہ کے مسافر کو سالک کہا جاتا ہے۔ بندۂ مومن کا مطلوب مقامِ احسان ہے۔

مقامات و منازلِ سلوک بندۂ مومن جب مقامِ "احسان" تک پہنچنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو اسے مقامِ اسلام اور مقامِ احسان کے درمیان ایک طویل راستہ طے کرنے کے لیے بہت سے مقامات پہ قیام کرنا پڑتا ہے اور بہت سی خطرناک گھاٹیوں کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ سب سے بڑی اور سب سے خطرناک گھاٹی نفس ہے۔ اربابِ تصوفِ مندرجہ ذیل الفاظ میں نفس کی تعریف کرتے ہیں۔

"نفس سے مراد بندے کے معلول اوصاف اور مذموم اخلاق و افعال ہیں، خواہ یہ اکتسابی ہوں یا طبعی"۔ [۱]

صوفیہ خواہ اہلِ حق ہوں یا فلسفہ زدہ اہلِ باطل اُن کے ہاں یہ امر متفق علیہ ہے کہ نفس اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان حجاب ہے اور اس حجاب کو قطع کیے بغیر بندہ اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ سالک کو اپنے مطلوب تک پہنچنے کے لیے نفس کی چوٹی کو بھی سر کرنا پڑتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال ہو تو سالک مختلف مقامات و احوال سے ہوتا ہوا شیطان اور نفس کی کھڑی کی ہوئی رکاوٹیں دور کرتا ہوا بالآخر اپنے مطلوب و مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ اہلِ حق کے نزدیک اس راہِ سلوک میں سالک کی منزل احسان ہے۔

ابن الجوزیؒ کے مطابق احوال و مقامات کی ترتیب اور ان پر کلام کرنے والے اوّلین شخص ذوالنون مصری ہیں۔ مشہور مستشرق ایڈورڈ براؤن بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ [۲]

احوال و مقامات میں فرق "حال" ان کیفیات و واردات کا نام ہے جو بغیر کسی قصد و ارادے

---

[۱] الرسالۃ القشیریۃ ص ۴۸ مدارج السالکین ۲ : ۶

[۲] تلبیسِ ابلیس ص ۲۳۲ تاریخ ادبیات ایران ۱ : ۲۹۸

اور بغیر کسی اکتساب کے سالک کے قلب پر ہجوم کر آتی ہیں۔ "مقام" اکتساب کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ اسبابِ سلوک کے نزدیک احوال مواہب کے زمرے میں آتے ہیں اور مقام امورِ کسبیہ میں شمار ہوتے ہیں۔

بعض اصحابِ تصوف کے نزدیک حال نتیجہ مقام ہوتا ہے اور مقامات اعمال کے نتیجے میں حاصل ہوتے ہیں، ہر وہ شخص جو اعمال کے لحاظ سے صالح تر ہے وہ اعلیٰ تر مقام پر فائز ہے، جو اعلیٰ تر مقام پر فائز ہے اسی کا حال عظیم تر ہے۔ شیخ ابوبکر محمد الکلاباذی فرماتے ہیں۔

"صوفیہ کرام کے علوم درحقیقت علومِ احوال ہیں، احوال اعمال کا نتیجہ ہیں۔ احوال کا وارث صرف وہی ہوتا ہے، جس کے اعمال صحیح ہوتے ہیں"[۱]

سید علی ہجویریؒ لکھتے ہیں۔

"مقام و حال میں فرق یہ ہے کہ مقام کا تعلق مجاہدے سے ہے اور مجاہدے سے حاصل ہوتا ہے یعنی یہ ایک کسبی شے ہے اس کے برعکس حال خدا کی عطا کردہ بزرگی ہے، یہ اس کے فضل اور لطف و عطیہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جب یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل پر وارد ہوتا ہے تو اپنے اختیار اور کسب سے اسے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جب یہ رخصت ہونے لگتا ہے تو اسے اختیار اور کسب سے روکا نہیں جا سکتا۔"[۲]

مقام و حال کے سلسلے میں ابن قیم رقمطراز ہیں۔

"اس بارے میں صحیح مسلک یہ ہے کہ اعتبارِ احوال کے لحاظ سے واردات و مقامات کے کئی نام ہیں۔ ابتداء میں ظہور کے وقت یہ واردات لمحاتِ برق کی مانند ہوتی ہیں جیسے بجلی چمکتی ہے تو بعد میں روشنی پھیلتی ہے۔ جب سالک کو یہ واردات پیش آتی ہیں اور وہ ان کو برداشت کر لیتا ہے تو یہ واردات حال بن جاتی ہیں۔ ابتداء میں یہ

---

[۱] التعرف لمذہب اہل التصوف ص ۸۶
[۲] کشف المحجوب ص ۲۴۲

واردات لمحات کی صورت میں تھیں، دورانِ وسط ان پر احوال کا اطلاق ہوا اور آخر میں مقامات کہلائیں"۔ [1]

مقامات کی ترتیب اور تعداد

مقامات کی ترتیب اور تعداد کے بارے میں اصحابِ تصوّف میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ تمام اصحابِ تصوّف ان مقامات و منازل کی ترتیب اور تعداد اپنے اپنے ذوق و مواجید اور تجربات کے مطابق بیان کرتے ہیں۔ راہِ سلوک کے ان مقامات کی ترتیب یقیناً سالک کی طبع اور استعداد کے مطابق ہوتی ہے۔ لہٰذا اکثر اصحابِ تصوّف مقامات کی ترتیب کے سلسلے میں کوئی خاص کلیہ بیان نہیں کرتے۔ ائمہ تصوّف ابو سلیمان دارانیؒ، عون بن عبداللہؒ، سہیل بن عبداللہ تستریؒ سید الطائفہ جنید بن محمد بغدادیؒ، ابو عثمان سعید بن اسماعیل نیشاپوریؒ اور یحییٰ بن معاذ عام طور پر ان مقامات اور منازل کی ترتیب کے بغیر ہی تزکیۂ نفس اور اعمالِ قلوب وغیرہ کے بارے میں بات کیا کرتے ہیں۔ ان کے مقامات کی تعداد بھی کسی خاص عدد میں محصور نہ تھی۔ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ یہ ترتیب اگرچہ ضروری نہیں تاہم سیرِ عیسیٰ کی مناسبت سے مستحسن ضرور ہے۔ اِس طرح تصدیقِ تام اور معرفتِ کامل حاصل ہوگی اور ان کو محفوظ رکھنا بھی آسان ہوگا۔

ابتدا میں تمام مقامات پر تکلفاً نازل ہوا جاتا ہے لیکن بتدریج یہ مقامات سالک کے اخلاقِ طبعی کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ احوال کبھی تو اوراد کا ثمرہ ہوتے ہیں، کبھی اعمالِ قلوب اُن کا باعث ہوتے ہیں۔ کسی مقام کا علم رکھنا اور چیز ہے، اس مقام میں نازل ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔ کسی مقام کا علم درحقیقت اس کی تعریف، اس کی ظاہری حدود، اس کے مراتب اور اس کے فقہی احکام پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن اس مقام پر نازل ہونا ایک رُوحانی تجربہ ہے۔ سالک کا کسی مقام پر نزول تب ہوتا ہے جب اس مقام کی معرفتِ کامل اپنے تمام تر تقاضوں کے ساتھ سالک کے قلب میں اُتر کر اُس کے احوال میں ظاہر ہوتی ہے۔

تزکیۂ نفس اعمالِ قلوب اور اعمالِ جوارح کی تصحیح کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ ان تمام مقامات کی معرفت اور ان کے تحقق سے اعمالِ جوارح اور اعمالِ قلوب کی تصحیح ہوتی ہے اور یہی دراصل عبودیت

---

[1] مدارج السالکین ۱: ۱۳۵

کی تکمیل ہے۔

مقاماتِ سلوک کے مآخذ ائمہ طریق نے تقریباً تمام منازل و مقامات قرآن اور سنّت سے اخذ کئے ہیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے شیخ ابو اسماعیل ہروی کی کتاب "منازل السائرین" کی شرح کرتے وقت ان مقامات و منازل کے مآخذ و مصادر کا ذکر کیا ہے۔ شرح کرتے ہوئے قرآن مجید کی ان تمام آیات کو نقل کیا ہے جن سے ائمہ طریق استدلال کرتے ہیں۔ ابن قیم نے ان مقامات کی حدود اور اُن کے مراتب و مدارج پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ وہ حدود اور مراتب ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیے ہیں۔ راہِ سلوک پر سفر کرنے کے لیے ان کی معرفت حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ ان کی کامل معرفت حاصل کیے بغیر منزل المقصود پر پہنچنے کا دعویٰ محض جہالت ہے۔ اصحابِ سلوک کے ذکر کردہ بعض مقامات ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن یا سنّت میں نہیں آیا۔ ابن قیمؒ اس قسم کے مقامات کو مقام تسلیم نہیں کرتے۔ مثلاً شیخ ابو اسماعیل ہرویؒ نے "منازل السائرین" میں "دہشت" کو منزل و مقام شمار کیا ہے۔ ابن قیمؒ کے مطابق قرآن و سنّت میں "مقام دہشت" کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ ائمہ طریق کا کلام بھی دہشت کے ذکر سے خالی ہے۔ بلکہ بسا اوقات "دہشت" تو قواطعِ طریق میں شمار ہوتی ہے۔

کچھ مقامات کے متعلق اصحابِ تصوف میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا وہ مقام ہیں یا اُن کو احوال میں شمار کیا جائے گا۔ مثلاً "رضا" کے مقام یا حال ہونے میں عراقیوں اور خراسانیوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ابو عبد اللہ حارث بن اسد محاسبیؒ اور شیخ علی ہجویری رضا کو حال تسلیم کرتے ہیں۔

مقامات کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق تمام مقامات کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ بعض مقامات ایسے ہیں جن کی تصحیح کیے بغیر دیگر مقامات کی تصحیح ممکن نہیں۔ مثلاً "توبہ" ایک مقام ہے اور وہ تمام مقامات جن کا ذکر اصحابِ تزکیہ نفس کرتے ہیں مقام توبہ کے آثار اور اس کی تفاصیل ہیں۔ توبہ کی تصحیح کیے بغیر دیگر مقامات کی تصحیح ممکن نہیں۔ توبہ اور استغفار ہر مقام پر سالک کے ساتھ رہتے ہیں اور زندگی کے آخری لمحات میں بھی وہ ان سے جدا نہیں ہوتے۔ اسی طرح "توحید" اوّلین مقام ہے۔ توحید انبیائے کرام اور رسولوں کی اوّلین دعوت ہے۔ "رضا" کا دارومدار "صبر"

لہ مدارج السالکین ۳ : ۵،

پر ہے۔ "توبہ" کا مدار "محاسبہ" پر ہے۔ محاسبہ اور صبر کسی مقام پر بھی سالک سے علیحدہ نہیں، ورنہ سالک اپنی راہ کھوٹی کر بیٹھتا ہے۔ اسی طرح بعض مقامات ایسے بھی ہوتے ہیں جو بعض دیگر مقامات کا مجموعہ ہیں۔ جیسے توبہ مقامِ "محاسبہ" اور مقامِ "خوف" کا مجموعہ ہے۔ "توکل" مقامِ "تفویض" مقامِ "استعانت" اور مقامِ "رضا" کا جامع ہے۔ ان تینوں مقامات کی تصحیح کیے بغیر توکل کا تصور ممکن ہی نہیں۔ مقامِ "خشیت" اللہ تعالیٰ اور اس کے حقِ عبودیت کی معرفت کا نام ہے۔

"منازل السائرین" کی شرح کرتے ہوئے ابن قیمؒ نے ان تمام مقامات کے تعلق کو بھی واضح کیا ہے۔

منازل و مقامات کے مدارج اکثر صوفیہ نے تمام مقامات و منازل کو مختلف مدارج میں تقسیم کیا ہے۔ کسی مقام کی معرفت سالک کے قلب میں جس قدر راسخ ہوگی۔ اسی کے مطابق اس کا اثر اس کے احوال میں ظاہر ہوگا۔ اور سالک اسی رسوخ کے مطابق اس مقام کے مختلف مدارج پر فائز ہوگا۔ بعض صوفیہ نے مقاماتِ سلوک میں سے ہر مقام کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

ان کے نزدیک پہلا درجہ عوام کا ہے۔

دوسرا درجہ خواص کا ہے۔

اور تیسرا درجہ خاص الخاص کا ہے۔

شیخ ابو اسماعیل عبداللہ ہرویؒ نے اپنی کتاب "منازل السائرین" میں ان مدارج کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ انہوں نے ہر باب میں تین کے عدد کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ توضیح اور شیخ ہروی کے اسلوب کے نمونے کے لیے "منازل السائرین" میں سے مقامِ رضا کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔ شیخ ابو اسماعیل فرماتے ہیں۔

رضا کے تین درجے ہیں:۔

پہلا درجہ عوام کا درجہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہونا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کی بندگی کو ناپسند کرنا۔ اسلام کا دارومدار اسی پر ہے اور یہی وہ چیز ہے جو شرکِ اکبر سے

نجات دلاتی ہے۔

رضا کی تصحیح تین شرائط کے ذریعے ہوتی ہے۔

بندے کے نزدیک اللہ تعالیٰ ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو۔

بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت ہر چیز سے زیادہ ہو۔

بندے کے نزدیک اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ اطاعت کا حقدار ہو۔[1]

رضا کا دوسرا درجہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات اسی پر ناطق ہیں اور یہ ہے اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر راضی ہونا۔ یہ خواص کے مسلک کی ابتدا ہے[2] اس کی صحت تین شرائط پر مبنی ہے۔

بندے کے نزدیک تمام احوال کا برابر ہونا۔

مخلوق کے ساتھ خصومت کو ترک کرنا۔

سوال والحاح سے نجات[3]

رضا کا تیسرا درجہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہونا ہے۔ چنانچہ بندہ اپنی ذات کے لیے کوئی سخط و رضا نہیں دیکھتا۔ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہونا بندے کو ترکِ تحکم، انقطاعِ اختیار اور اسقاطِ تمیز پر ابھارتا ہے، خواہ اسے آگ میں کیوں نہ ڈال دیا جائے۔[4]

شیخ ابو اسماعیل ہروی کے عصر میں اور اُن سے پہلے تصوف کی اکثر تصنیفات میں یہ اسلوب نایاب ہے۔

حفاظتِ احوال احوال کی حفاظت دو طرح سے ہوتی ہے۔

اوّل: سالک اس لحاظ سے اپنے احوال کی حفاظت کرتا ہے کہ مبادا وہ بدل جائیں۔ اس لیے وہ ان میں تلکہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ان تمام امور سے اجتناب کرتا ہے جن کی وجہ سے اس کے احوال میں تغیر آجاتا ہے اور آہستہ آہستہ وہ ان احوال سے محروم ہو جاتا ہے۔

---

[1] مدارج السالکین ۲ : ۱۸۲

[2] ایضاً ۲ : ۱۸۳ [3] ایضاً ۲ : ۲۰۴ [4] ایضاً ۲ : ۲۴۰

دوم:- سالک اس لحاظ سے بھی ان احوال کی حفاظت کرتا ہے کہ جب یہ احوال وکیفیات اس پر طاری ہوتے ہیں (اور اگر وہ اپنے احوال میں صادق ہے) تو وہ ان احوال کو لوگوں سے پوشیدہ رکھتا ہے - اور حتی الامکان لوگوں پر اپنی ان کیفیات کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ بغیر کسی راجح مصلحت اور حقیقی ضرورت کے اپنے احوال کو ظاہر کرنا حماقت اور عجز پر دلالت کرتا ہے۔ اصحابِ صدق تو ہمیشہ اپنے احوال کو چھپاتے رکھتے ہیں بلکہ ملامتیہ سلسلہ سے تعلق رکھنے والے اصحابِ سلوک تو واردات سے متضاد احوال کا اظہار کرتے ہیں۔ لہذا احوال میں بہت بڑا فتنہ ہے اور شیطان انسان کا ازلی وابدی دشمن ہے۔

مقامات واحوال کی تجرید اہلِ صدق ہمیشہ اپنے احوال پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور احوالِ صحیحہ اور احوالِ باطلہ میں فرق و امتیاز کرتے ہیں۔ احوالِ باطلہ پر ذکر اور توجہ الی اللہ کے ذریعے غلبہ پاتے ہیں۔ نیز ان اسباب کا کھوج لگاتے ہیں جن کی بنا پر ان پر غیر مطلوب احوال طاری ہوتے۔ اہلِ صدق لمحہ بھر کے لیے اپنے نفس کے شر سے غافل نہیں ہوتے۔ اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ اس مقام پر کیسے قدم پھسل جاتے ہیں۔

اصحابِ تصوف کے نزدیک مقامات واحوال کی تجرید بہت ضروری ہے یعنی سالک اپنے مقامات اور احوال کی رؤیت اور ملاحظہ سے تجرید کرے۔ رؤیت و ملاحظہ سے تجرید کے بغیر سالک کے مقامات واحوال کی تصحیح نہیں ہوتی۔ اسی طرح ان مقامات واحوال کی صحت، ان کی تفرید بھی بہت ضروری ہے۔ تفرید یہ ہے کہ اس کے تمام افعال صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوں اور کوئی فعل رؤیتِ نفس یا مخلوق کے دکھاوے کے لیے نہ ہو۔ یعنی ہر فعل رؤیت کے شائبے سے پاک ہو۔

(باقی)

سیّد نواب صدیق حسن خاں ——— اور خدمتِ حدیث

جناب عبدالرشید عراقی صاحب

حضرت نواب صاحب ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۸ھ بانس بریلی میں پیدا ہوئے۔ بانس بریلی آپ کا ننہال تھا۔ مگر آپ کی جائے سکونت قنوج ہے۔ آپ کا تعلق حسینی سادات سے ہے۔ اور سلسلۂ نصب ۳۳ واسطوں سے جناب سیّد البشر رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچتا ہے۔

سیّد اولاد حسن قنوجی آپ کے والد ماجد سیّد اولاد حسن قنوجی (م ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۰ء) اپنے وقت کے ممتاز اور جیّد عالم تھے۔ مولانا سیّد اولاد حسن ابتدا میں شیعہ تھے۔ مگر مولوی رستم علی بن ملّا اصغر قنوجی کی تبلیغ سے شیعیت سے توبہ کی اور اس کے بعد لکھنؤ میں مرزا حسن علی محدث اور دہلی میں شاہ رفیع الدین محدّث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) اور حضرت شاہ عبدالعزیز (م ۱۲۳۹ھ) سے حدیث، فقہ اور تفسیر کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مجاہد فی سبیل اللہ حضرت سید احمد شہید بریلوی (م ۱۲۴۶ھ) سے بیعت کر لی۔ سیّد صاحب نے آپ کو خلافت کے خلعت سے نوازا۔ مولانا شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز کے علاوہ مولانا شاہ عبدالقادر (م ۱۲۳۳ھ) سے بھی استفادہ کیا۔ حضرت سیّد احمد شہیدؒ سے آپ کی والہانہ محبت تھی اور سیّد احمد بھی آپ سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔

آپ نے قنوج میں توحید و سنّت کی بہت زیادہ تبلیغ کی، اور آپ کی تبلیغ سے عقائد و اعمال کی بڑی اصلاح ہوئی۔ قنوج کی کثیر آبادی متبعِ سنّت ہوگئی۔

تورّع و استغنا میں سلف کا نمونہ تھے۔ اسی تقویٰ و احتیاط کی بنا پر والد کی عظیم الشان جائداد چھوڑ دی۔ ایک مرتبہ سیّد صاحب نے فرمایا کہ:-

"سید برادر! شما اموالِ کثیر والد خود کہ حسابش بہ لکوک می رسد چرا گزاشتید، امروز آں زر بسیار اگر بدست شما می بود بکار مسلماناں می آمد۔"

مولانا نے جواب دیا۔

"خودم گزاشتم۔ پدرم شیعی بود و مال بسیار فراہم آوردہ و عمارتِ بسیار برائے نام آوری بنیاد نہادہ۔ ندانم کہ از وجہ حلال است یا حرام۔ اگر حرام است خود گرفتنی نیست و اگر حلال است حق تعالیٰ مرا عوضِ آں دولتِ علم بخشیدہ، از اں مستغنی فرمودہ است۔ ؎

فان المال یفنی عن قریب
وان العلم یبقی لا یزال

بلکہ گمانِ کراہیت و حرمت قوی است، زیرا کہ ہر کہ در دینِ خود امین و ناقد نباشد، در امرِ دنیا از وجہ امانت خیزد۔"

(کاروانِ ایمان و عزیمت۔ از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ ص ۸۷)

سید اولاد حسن نے تبلیغ کے ساتھ تصانیف کا شغل بھی جاری رکھا۔ آپ کی تصانیف کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ الاختصاص، بیان الحدود والقصاص (عربی)۔ (۲) تقویۃ الیقین برد المشرکین۔ (۳) نور العرفا من مرآۃ الصفا (فقہ)۔ (۴) راہ جنت (شرح چہل حدیث) فارسی نظم۔ (۵) رسالہ در معنی کلمۂ توحید۔ (۶) فتویٰ ردِّ تعزیہ۔ (۷) رسالہ در بیان ما اُہِلَّ بہ لغیر اللہ (پڑھا نہیں جا سکا)

۸ ترجمہ حبل المتین۔ (۹) القول المتین فی حقوق الخلق اجمعین۔ (۱۰) رسالہ در بیانِ آدابِ وعظ۔ (۱۱) رسالہ در بیان بیعت وانواع و حقائقِ آں۔ (۱۲) ہدایت المومنین (در ردِّ تعزیہ) یہ تمام کتابیں فارسی میں ہیں۔ اردو میں راہِ سنت منظوم و رسالہ در منعِ افروختن چراغاں بر قبور (تراجم علمائے حدیث ہند جلد اول۔ مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی۔ ص ۲۷۳)

۱۲۵۳ھ میں قنوج میں انتقال کیا۔ حضرت نواب صدیق حسن خاں اس وقت ۵ سال کے تھے۔

ابتدائی تعلیم | آپ نے ابتدائی تعلیم میزان منشعب سے لے کر شرح تہذیب اور مختصر معانی اپنے

برادرِ بزرگ مولانا سید احمد حسن عرشی (م ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء) سے پڑھے[1]۔ سید احمد علی (فرخ آبادی) جو آپ کے والد کے مریدوں میں سے تھے، فرخ آباد لے گئے۔ اُن کے زیرِ سایہ کافیہ اور شرحِ جامی مولوی محمد حسین شاہ جہان پوری سے اور قطبی، میر قطبی، افق المبین، در مختار، مشکوٰۃ المصابیح دوسرے اساتذہ سے پڑھیں۔ اس کے بعد کان پور پہنچے وہاں ملا محمد مراد بخاری اور مولوی محمد محب اللہ پانی پتی سے بھی استفادہ کیا۔ کان پور میں آپ کا جانا آپ کے والد ماجد کی شہرت کی وجہ سے ہوا۔ اور یہ عقیدت آپ کے والد ماجد کے حضرت سید احمد بریلوی[2] شہید کے خلیفہ ہونے کی وجہ سے تھی۔

دہلی میں | ۱۲۶۹ھ میں تکمیلِ تعلیم کے سلسلے میں دہلی پہنچے۔ اور صدر الافاضل علامہ صدر الدین

[1] مولانا سید احمد حسن ۹ رمضان ۱۲۴۶ھ کو قنوج میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قنوج میں حاصل کی۔ اس کے بعد تکمیلِ تعلیم کان پور، فرخ آباد، بریلی اور علی گڑھ میں ہوئی۔

مولانا احمد حسن جملہ علوم نقلی و عقلی میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ عمل بالسنۃ کے بڑے شیدائی تھے اور اس کا ثبوت آپ کی کتاب "شہابِ ثاقب" سے ملتا ہے جس میں آپ نے تقلید کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں مرزا غالب سے مشورۂ سخن حاصل تھا۔

ہمیشہ زیارۃ الحرمین کا شوق رہا۔ تیسری مرتبہ بارادۂ حج روانہ ہوئے تو ریاست بڑودہ میں مولوی غلام حسین بن مولوی رستم علی قنوجی کے مکان پر اترے۔ اور تپ اسہالی میں مبتلا ہو کر بہ سال ۱۲۷۷ھ سفرِ آخرت اختیار کیا اور وہیں بڑودہ میں دفن ہوئے۔

(تراجم علمائے حدیث ہند ص ۲۷۶)

[2] حضرت سید احمد شہید پر لکھنا میرے جیسے کم علم کی کیا جرأت ہو سکتی ہے۔ ان پر ضخیم کتابیں تیار ہو چکی ہیں۔ سید احمد شہید از مولانا غلام رسول مہر (م ۱۹۷۶ء) اور سیرۃ سید احمد شہید از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دام مجدہٗ

آزردہ دہلوی[1] (م ۱۲۸۵ھ) کی خدمت میں ایک سال آٹھ ماہ تک حاضر رہ کر آپ سے یہ کتابیں پڑھیں:۔

مختصر معانی (تا آخر)، شرحِ وقایہ (عبادات تک)، ہدایہ (معاملات تک)، توضیح و تلویح قطبی و میر قطبی (تمام)، سلم العلوم، ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک، صدرا (الی مالیعلم الاجسام) شمس بازغہ، میر زاہد، میر زاہد شرح مواقف (الی بحث الوجوہ) میر زاہد (رسالہ الی المذہب المنصور) حاشیہ ملا عبد العلی بحر العلوم بر رسالہ میر زاہد (درس تک)، ملا جلالی شرح مطالعہ (سماعۃً) تحریر اقلیدس مقالۂ اوّل مقاماتِ حریری، مقاماتِ ہندی (چند مقالہ سماعۃً)، دیوانِ (لفظ پڑھا نہیں جاسکا) (بعض حصص)، دیوان متنبی (بقدر نصف) سبعۂ معلقہ، شرح عقائد نسفی، تفسیر بیضاوی (آخر سورہ بقرۃ تک) الجامع الصحیح ۴ پارے قراءۃً باقی کتاب سماعۃً۔

حدیث کی تعلیم | حضرت نواب صاحب نے حدیث کی تعلیم و سند و اجازہ حدیث ان حضرات سے حاصل کی شیخ زین العابدین ابن محسن بن محمد السبعی الانصاری، شیخ عبد الحق محدث بنارسی[2] (م ۱۲۸۶ھ) تلمیذ قاضی شوکانی

[1] حضرت علامہ مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی جامع کمالات تھے۔ تمام علوم صرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضیات، معانی، بیان، ادب، انشاء، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ علوم نقلیہ فقہ، حدیث حضرت شاہ عبد العزیز آپ کے برادران سے پڑھے۔ حضرت شاہ محمد اسحاق (م ۱۲۶۲ھ) سے بھی استفادہ کیا۔ مولانا صدر الدین بڑے صاحب وجاہت و ریاست اور اپنے زمانہ میں یگانۂ روزگار اور نادرۂ عصر تھے۔ قوتِ حافظہ، حسنِ تحریر و متانت تقریر، فصاحت بیان اور بلاغت معانی میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ نے ۸۱ سال کی عمر میں ۲۴ ربیع الاوّل ۱۲۸۵ھ کو انتقال کیا۔ (علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد ۴)

[2] مولانا عبد الحق بنارسی ایک جیّد عالم تھے۔ حضرت شاہ عبد القادر دہلوی (م ۱۲۳۳ھ) کے شاگرد رشید تھے اور حضرت شاہ اسماعیل الشہید (م ۱۲۴۶ھ) آپ کے ہم سبق تھے۔ امیر المومنین حضرت السید احمد شہید بریلوی (م ۱۲۴۶ھ) اور حضرت شاہ اسماعیل الشہید کے ساتھ زیارتِ حرمین شریفین سے مشرف ہوئے تھے۔ دہلی سے تکمیل کے بعد یمن جا کر امام محمد شوکانی (م ۱۲۵۰ھ) سے حدیث پڑھی اور سند و اجازہ بنفسہ امام شوکانی نے انہیں عطا کی۔ اور سند کا نام "اتحاف الاکابر باسناد الدفاتر" ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

یمنی (م ۱۲۵۰ھ) الشیخ یحییٰ بن محمد بن احمد بن حسن الکازمی (قاضی عدن)، علامہ سید نعمان خیر الدین آلوسی زادہ (مفتی بغداد) اور قاضی شیخ حسین عرب یمنی[1] اور حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی مہاجر مکی[2] (م ۱۲۸۳ھ) سے بذریعہ خطوط استفادہ کیا۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد حضرت نواب صاحب ۲۱ سال کی عمر میں علومِ متداولہ سے فراغت حاصل کر کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ۸ ذوالحجہ ۱۳۰۶ھ (۱۱ مارچ ۱۸۸۷ء) کو انتقال کیا۔ (تراجم علمائے ہند)

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] شیخ حسین بن محسن کا شمار علمائے حدیث کے ممتاز علماء میں ہوتا تھا۔ اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ آپ نے اشاعتِ حدیث میں جو کردار ادا کیا ہے، وہ تاریخ کے صفحات میں سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ زمانہ قیامِ بھوپال میں آپ نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے، ان کی جھلک مولانا ابو الحسن علی ندوی کے ہاں دیکھی جا سکتی ہے۔

"شیخ حسین بن محسن کا وجود اور ان کا درس حدیث ایک نعمتِ خداوندی تھا، جس سے ہندوستان اس وقت بلاد عرب و یمن کا ہمسر بنا ہوا تھا۔ شیخ حسین بہ یک واسطہ علامہ محمد بن علی شوکانی صاحب نیل الاوطار کے شاگرد تھے۔ فتح الباری ۱۳ جلد اور ایک مقدمہ (کل ۱۴) شیخ صاحب کو حفظ تھی۔ وہ ہندوستان آئے تو علماء و فضلاء نے پروانہ وار ہجوم کیا۔ ۱۰ جمادی الثانی ۱۳۲۷ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔"

(تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص ۱۴۴)

[2] مولانا شاہ محمد یعقوب (م ۱۲۸۳ھ)، حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) کے نواسے تھے اور حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی (م ۱۲۶۲ھ) کے چھوٹے بھائی تھے۔ مولانا شاہ عبد العزیز کے شاگرد تھے۔ امیر المومنین السید احمد شہید کی بیعت سے مشرف تھے۔ جب تک دہلی میں مقیم رہے تدریس فرمائی۔ آخر مکہ معظمہ ہجرت فرمائی تو وہاں یہی مشغلہ جاری رکھا۔ ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۸۳ھ (۱۳ اپریل ۱۸۶۷ء) مکہ معظمہ میں رحلت فرمائی۔

(تراجم علمائے حدیث ہند ص ۱۲۱)

دہلی سے واپس وطن قنوج پہنچے۔ مگر یہاں قنوج میں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے، اس لیے کہ ذریعہ معاش کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ چنانچہ "فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ" کے مطابق رختِ سفر باندھا۔ اور بھوپال تشریف لے گئے۔ جہاں کی علم پروری کا غلغلہ ہر سو بلند تھا۔ مگر آپ نووارد تھے اور نووارد کا کون یار و مددگار ہو سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ہر ایک کا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے ہر ایک کا رزق اپنے ذمہ لیا ہے۔ چنانچہ آپ نے مولانا محمد جمال الدین کو، جو اس وقت مدار المہام کے اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ ملازمت کے لیے درخواست دی، اور مولانا علی عباس چڑیا کوٹی[1] جو ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے، کی سفارش سے ۳۰ روپیہ ماہانہ پر ملازمت مل گئی۔ مگر یہ ملازمت زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی، اس لیے کہ مولانا علی عباس چڑیا کوٹی سے حقہ نوشی پر بحث ہو گئی اور آخر یہ بحث آپ کی ملازمت کی معزولی کا سبب بن گئی۔ آپ کی یہ ملازمت تقریباً ایک سال رہی۔

معزولی کے بعد دوبارہ وطن قنوج آئے اور ہنوز سلسلۂ معاش کی فکر میں تھے کہ ۱۸۵۷ء (۱۳۰۳ھ) کا ہنگامہ رونما ہوا جس کی زد میں قنوج بھی آگیا اور اس سے آپ کا خاندان بھی متاثر ہوا۔ چنانچہ آپ نے قنوج کو خیر باد کہا اور بلگرام میں سکونت اختیار کر لی۔

دوسری مرتبہ بھوپال میں

جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ سرد ہوا تو نواب سکندر جہاں صاحبہ نے از خود فرمانِ طلبی بھیجا۔ مگر موسم کی ناہمواری کے باعث آپ دیر سے بھوپال پہنچے۔ معاندین کو پورا موقع مل گیا اور حکم منسوخ ہو گیا۔ اور یہ شعر پڑھتے ہوئے لوٹے۔

[1] مولانا علی عباس بن شیخ امام علی ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے چچا مولانا احمد علی چڑیا کوٹی (م ۱۲۷۲ھ) اور مولانا ابوالحسن منطقی (م ۱۲۹۳ھ) سے علوم و فنون کی تحصیل کی۔ قدرت نے حفظ کی دولت سے حصہ وافر دیا تھا۔ اس لیے کتبِ درسیہ وغیرہ کے اکثر اہم مسائل ذہن کی گرفت میں آگئے۔ چنانچہ درس نظامیہ کی اکثر کتابیں حواشی و شرح کی جانب مراجعت کے بغیر نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے۔ ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ میں انتقال کیا۔

(تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۴۔ تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص ۲۲۷)

ما ز بھوپال گذشتیم تو دل ساختنی[۱]
قفل بر در مزن و خانہ بہ دیوار مَنِہ

یہ واقعہ ۱۹ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ کا ہے۔

آپ بارادہ قنوج براستہ ٹونک پہنچے۔ ٹونک میں آپ کو ملازمت کی پیش کش ہوئی، آپ نے منظور فرمائی۔ مگر ۲ ماہ کے قیام سے ہی دل برداشتہ ہو گئے۔ اور رخصت لے کر قنوج جانے والے تھے کہ دوبارہ بھوپال طلبی ہوئی۔

تیسری مرتبہ بھوپال میں

۱۲۷۶ھ میں تیسری بار بھوپال پہنچے اور ۷۵ روپے ماہوار مشاہرہ پر ملازمت مل گئی۔ اور تاریخ نگاری کی خدمت پر مامور ہوئے۔ اب حضرت نواب صاحب کے دن پھرے۔ مدار المہام منشی محمد جمال الدین کی صاحبزادی سے نکاح ہوا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ترقی کے منازل طے کرنے لگے۔ انہی دنوں نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ سریر آرائے سلطنت ہوئیں، جو بیوہ ہو چکی تھیں۔ بیگم صاحبہ، نواب صاحب کی قابلیت سے متاثر تھیں، اس لیے ان کو شریکِ امورِ سلطنت بنایا ساتھ ہی نواب صاحب سے نکاح کر لیا۔ اس کی وجہ سے آپ دین و دنیا کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے۔

(باقی)

۱؎ مصرع اول درست نہیں ہے (مدیر)

رسائل و مسائل

ترقیات، مادّی علوم اور اسلام

سوال:- دورِ حاضر میں اسلام اور مسلم معاشرہ کے موضوع پر میں ایک تحقیقاتی مقالہ ترتیب دے رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ اپنے مصروف اور قیمتی اوقات میں سے کچھ وقت ان سوالات کا جواب دینے کے لیے نکالیں گے۔ آپ کے مشورے ہمارے لیے رہنما ہوں گے۔

۱۔ اسلام میں ترقی کا کیا مفہوم ہے؟

۲۔ مسلمان کا کیا نصب العین ہے؟ اور اس کے حصول کے لیے موجودہ مادی طاقت کہاں تک ضروری ہے؟

۳۔ اسلام میں علم سے مراد کیا لی جاتی ہے؟

۴۔ دورِ حاضر میں کیا سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم کے حصول کے بغیر اسلام کا احیا ممکن ہے؟

۵۔ جدید ٹیکنالوجی نے مغربی ممالک میں جو اخلاقی اور معاشرتی خرابیاں اور بیماریاں پیدا کی ہیں اُن کا سدِّباب اسلام کس طرح کر سکتا ہے؟

۶۔ دورِ حاضر میں مغربی اقوام عورتوں اور مردوں کی مجموعی قوت کو ترقی کے لیے ضروری سمجھتی ہیں؟ اسلام نے اس ضمن میں عورت کو کیا ذمہ داریاں سونپی ہیں، حدود متعین کیجیے۔

۷۔ قرآن میں آیات (دنیا) پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں نے عام طور سے اس پہلو کو نظر انداز کیا ہے؟ یہ کام اگر اب شروع کیا جائے تو ہم عصر اقوام کے ہم پلہ ہونے کے لیے کیا صدیاں درکار نہ ہوں گی؟

۸۔ اسلام کے دورِ عروج میں سائنس اور ٹیکنالوجی سے منسلک علوم میں مسلمانوں نے

ایک امتیازی نشان حاصل کیا؟ کیا یہ صحیح ہے؟ ان علوم کا اثر مسلم معاشرہ پر کس طرح پڑا اور وہ برائیاں اور خرابیاں کیوں پیدا نہ ہوئیں جو آج کل ہیں؟

۹۔ یہ سوال اکثر ذہن میں اُبھرتا ہے کہ ہم عصر سماج میں مسلم معاشرہ کا امتیازی حصہ کس نوعیت کا ہے۔

۱۰۔ کیا مادی ترقی اخلاقی اور روحانی ترقی کا ذریعہ بن سکتی ہے؟ جب کہ قرآن کی آیت ہے کہ اگر ہم اُن کو دُنیا میں حکومت دیں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ نافذ کریں..... یعنی مادی ترقی کو شرعی احکام کے نفاذ کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔

۱۱۔ جدید انسان اور اسلام کے درمیان اتفاق اور اختلاف کے نقاط کا تعین کیجیے؟

۱۲۔ اسلامی معاشرہ کو مغربیت سے بچانے کی کوشش، جو بلاشبہ مطلوب ہے، کیا ہم اس انداز سے نہیں کر رہے کہ اسے جدیدیت (MODERNIZATION) سے دُور کر رہے ہوں؟ کیا یہ اسلام کے لیے مضر نہیں ہے؟ اس کا حل آپ کیا پیش کرتے ہیں؟۔

۱۳۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کے رول خصوصاً سیاست، معیشت اور ملازمت وغیرہ میں اس کے حقوق پر مسلم علماء نے جو رائے قائم کی ہے وہ اکثر لوگوں کے نزدیک غیر اطمینان بخش ہے۔ قرآن اور سنت کی روشنی میں جدید عورت کے حوصلوں اور توقعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا کوئی معتدل راہ نکالی جاسکتی ہے؟

جواب:۔ محترمی و مکرمی! السلام علیکم

آپ کے سوالات نہ صرف تعداد میں زیادہ ہیں بلکہ اُن کا دائرۂ فکر اتنا وسیع ہے کہ ایسی بحثوں کو خط و کتابت ہی میں سمیٹنا بہت مشکل ہے۔ پھر اس کام کے لیے وقت بھی وافر چاہیے اور میں دولتِ وقت کے لحاظ سے بہت مفلس ہوں۔

سرسری جواب میں لکھ رہا ہوں، مگر اس سے شاید آپ کا اور دوسروں کا مطمئن ہونا مشکل ہے۔ بہرحال جواب نمبروار درج ہیں۔

۱۔ اسلام میں ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان فکر و عمل، اخلاق و کردار اور تمدن میں اپنے انفرادی

اور اجتماعی پارٹ کے لحاظ سے ہر لحظہ پیش رفت کرے اور قدم بہ قدم علو و رفعت کی طرف بڑھے۔ مادی وسائل، معاشی وسعت اور تمدنی ادارات کی بہتر سے بہتر تشکیل کرنے کا ہدفِ مقصود انسان کی فلاح ہونا چاہیے۔

۲۔ مسلمان کا نصب العین یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے حقیقت کا شاہد بن کے اُٹھے، دعوت الیٰ الخیر دے اور شر کی قوتوں کا استیصال کرنے کی کوشش کرے۔ پہلے فرد کی حیثیت سے، پھر جماعت کی حیثیت سے اور تکمیلی مرحلے میں حکومت کی سطح سے۔

اس عظیم مہم کے لیے بہتر سے بہتر وسائل سے کام لینا ضروری ہے، نیز مزید بہتر وسائل کو پیدا کرنا بھی مطلوب!

۳۔ اسلام میں علم کی دو قسمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہیں۔ ایک ہے علمِ ادیان، یعنی زندگی بسر کرنے کے لیے مختلف ادیان، نظریوں، نظاموں اور تحریکوں کا علم حاصل کرنا اور صحیح دین کو اپنے لیے پسند کرنا۔ دوسری قسم ہے علمِ ابدان یا علمِ اشیا۔ اس میں طبیعیات سے لے کر طب تک وہ تمام علوم داخل ہیں، جن کے ذریعے آدمی خدا کی پیدا کردہ مخلوق، موجودات اور اشیا کی ماہیت، اُن کے خواص اور اُن کے ذریعے کام کرنے والی قوتوں اور اُن پر چلنے والے قوانین سے آگاہی حاصل کرتا ہے اور پھر حاصل شدہ علم کے ذریعے اشیا اور قوتوں کو اپنے مقصد کے لیے بہتر سے بہتر طور پر استعمال کر سکتا ہے۔

پہلا علم ہر فرد کے لیے فریضۂ اساسی ہے، یعنی ہر مسلمان کو یہ جاننا چاہیے کہ زندگی کے لیے صراطِ مستقیم کیا ہے، اسی سلسلے میں اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ علمِ وحی کو سمجھے، کتاب و سنت کو جانے، اور دوسری طرف باطل ادیان اور باطل نظاموں (خواہ وہ روحانی و اخلاقی نوعیت کے ہوں یا سیاسی و معاشی نوعیت کے) کو پہچانے۔

۴۔ اسلام کا احیاء چونکہ ایک معاشرے کے قیام اور ایک ریاست کے وجود کا طالب ہے، اس لیے یہ تقاضا سائنسی اور ٹیکنالوجیکل قوتوں کو استعمال میں لائے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔

۵۔ یہ سوال ایسا نہیں کہ دو سطری جواب دیا جا سکے۔ آپ کو ان تمام خرابیوں اور بیماریوں کو الگ الگ متعین طور پر سامنے رکھنا ہوگا اور پھر ہر ایک سے تحفظ کی تدبیر اختیار کرنی ہوگی۔ ایک اصولی

بات یہ ہے کہ خرابی کا باعث سائنس اور ٹیکنالوجی بجائے خود نہیں بلکہ وہ انسانی ذہن ہے جو مختلف وسائل اور قوتوں کو خدا ناشناسانہ نقطۂ نظر سے استعمال کرتا ہے۔

۶۔ مرد اور عورت کو مساوی اور یکساں تصور کر کے "دوش بدوش ترقی" کا جو فلسفہ اختیار کیا گیا ہے، اسلام میں اُس کی جگہ نہیں ہے۔

عورتوں کے لیے سارے انسانی اور نسائی حقوق اسلام میں موجود ہیں، مگر دو پابندیوں کے ساتھ۔ ایک یہ کہ عورتوں کا دائرۂ کار گھر اور خاندان ہے۔ عورت کو عمومی طور پر گھر سے نکالنے والے معاشرے جن بلاؤں سے دوچار ہیں اور خود اُن کی عورتیں جس ذلتِ نسائیت کا سامنا کر رہی ہیں، اُس کی تفصیل دینے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اسلام نے عورت کو گھر میں بطور قیدی کے نہیں بٹھایا، بلکہ نئی نسلوں کو انسانیت اور اسلام سے اور خاندان کو خدا پرستانہ تہذیب کی روایات سے آراستہ کرنے کی عظیم اور مقدس ذمہ داری اُس کے سپرد کی ہے۔ امومت کے سائے سے محروم نسلیں جس ذہن و اخلاق کے ساتھ جدید تہذیب اختیار کرنے والے معاشروں میں اُبھر رہی ہیں اُن میں نہ صرف قومی حد تک جرائم میں تیز رفتار اضافہ ہو رہا ہے اور اطفال کا وحشی پن نت نئی مصیبتیں کھڑی کر رہا ہے بلکہ بین الاقوامی سطح پر نگاہ ڈالیں تو دورِ رواں کے انسانوں میں بڑی خوفناک جنگ کیشی اور تشدد پسندی پائی جاتی ہے۔ جا بجا جنگ و جدل کا چھڑنا، جنگی کارروائیوں میں انسانیت کی ہر قدر کا تباہ ہونا، انقلابات اور انقلابات کی درندگی، چھاپہ ماروں کا ظہور، افراد کے علاوہ جہازوں کا اغوا، ہر طرف بڑھتی ہوئی جاسوسی اور فریب کاری اور فحاشی اور بے حیائی۔ یہ سارے مظاہر صاف صاف یہ شہادت دیتے ہیں کہ جدید عورت نے نسلوں کی تربیت میں جو کوتاہی آزادی اور ترقی کی رَو میں آکر برتی ہے اب پوری دنیا اُس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔

اسلام جس کا مقصد ہی اعلیٰ درجے کے انسان پیدا کر کے اُن کے ذریعے خیر و فلاح کے نظام کو چلانا اور ساری دنیا میں برائی کی قوتوں کے خلاف نیکی کی قوتوں کو حرکت میں لانا ہے، وہ کیسے عورت کو انسان سازی کے عظیم منصب کو چھوڑ کر اندھی آزادی و ترقی کے جنگل میں بھٹکنے کا مجاز قرار دے سکتا ہے۔

دوسری پابندی یہ کہ وہ گھر سے نکلے تو قانونِ حجاب کی پابندی اختیار کرے اور نامحرموں کے ساتھ

محفل آرائی نہ کرے۔

بظاہر اس دوسری پابندی کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ پردہ ترقی میں رکاوٹ ہے۔ یہ اعتراض بالکل غلط ہے۔ ایسی خواتین موجود ہیں جو پردے کے ساتھ اعلیٰ سے اعلیٰ سائنسی تعلیم تک حاصل کرتی ہیں، پابندِ حجاب ڈاکٹر خواتین موجود ہیں جو ہسپتالوں میں فرائض انجام دے رہی ہیں اور وہ بھی ہیں جو اعلیٰ مدارج میں معلمی کر رہی ہیں۔ اسی ملک میں مس خدیجہ فیروز الدین مرحوم تھیں جو پردے کی اتنی شدید پابندی کے ساتھ مغربی ممالک کا سفر کر آئی تھیں کہ ان کے ہاتھ دستانوں سے اور پیر جرابوں سے ڈھنپے ہوتے۔ خواتین میں وہ بھی ہیں جو برطانیہ یا امریکہ میں رہنے کے لیے گئیں اور انہوں نے خود تیار کر کر کے برقعے دوسری بہنوں کو پہنائے۔ کسی کے کام میں خلل نہیں پڑا۔ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہوائی جہاز چلانے اور میزائیل چھوڑنے سے لے کر خلائی جہاز میں آسمان پردازی تک کوئی مرحلہ ایسا نہیں کہ ایک مومنہ صادقہ اپنے پردے کو قائم رکھتے ہوئے ذمہ داری ادا نہ کر سکے۔ اسی طرح شہروں میں ان کے لیے کھیل کے الگ پردہ دار میدان ہو سکتے ہیں۔

لیکن میں اس کا قائل نہیں کہ گھر کو چھوڑ کر باہر بھاگنے کا وہ جنون ہماری خواتین پہ طاری کیا جائے اور مرد ہی اسے بھڑکانے والے ہوں جو مغربی خواتین کی نسائیت کو اجاڑ چکا ہے۔ بعض وہ کام ہیں جو عورتوں ہی سے متعلق ہیں۔ مثلاً عورتوں کی تعلیم یا عورتوں کا علاج وغیرہ، یا پھر کچھ ایسے کام ہو سکتے ہیں کہ کسی شدید آزمائش کی صورت میں کرنے پڑیں۔ اور ایسے کاموں کے لیے کچھ عورتوں کو تیار رکھنا پڑے۔

واضح رہے کہ تاحال ہمارے مردوں کی تعداد (MAN - POWER) اتنی زیادہ ہے کہ عورتوں کو میدان میں لانے کے معنی زیادہ قوی صنف کے لاکھوں افراد کو بے روزگاری میں جھونک دینا ہے پہلے مردوں کو کام سے لگایئے، پھر اگر کمی پڑ جائے تو عورتوں کو طلب کیجیے، مگر اس شرط پہ کہ ہر کارخانے اور دفتر میں ان کے لیے علیحدہ باپردہ جائے کار کا انتظام ہو۔ ان کی کارکردگی کا وقت بھی کم رکھیے۔ تاکہ وہ بچوں کی مناسب دیکھ بھال کر سکیں اور بزرگوں، بہنوں بھائیوں اور دیوروں بھاوجوں کے ساتھ شامل ہو کر گھر کی فضا کو ان جذبوں اور ان قدروں سے مالا مال کر سکیں جن کے مرجھا جانے سے سارا معاشرہ برباد ہو جاتا ہے۔ محض اقتصادی دولت تو آپ مردوں عورتوں سب کو جھونک کر زیادہ کما سکتے ہیں

مگر ایمانی و اخلاقی دولت لُٹ جائے گی۔

اس قسم کے معاملات جن میں فاسد تہذیب کے غلبے کی وجہ سے مسلمان اُلجھے ہیں، خصوصاً ہمارے وہ طبقے جو ذہنی مسحوریت کا شکار ہیں، اُن کے متعلق میرا ذہن قطعی یکسو ہے۔ میں جب یہ مانتا ہوں کہ خداوند قدوس خدائے برحق ہے اور حاکم مطلق اور ہدایت دہندۂ انسان، اور جب میں یہ مانتا ہوں کہ رسول اکرمؐ سچے رسول تھے اور آپؐ کی سنت اور اسوہ واجب الاتباع ہیں تو پھر میں کتاب و سنت کے صاف اور واضح احکام کو اپنی پسند کا مفہوم دینے کے لیے تاویل یا تحریف سے نہیں گزار سکتا۔ مسلمان کو قطعی اور دوٹوک راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر شریعت میں پردہ ہے تو اُس کا کڑا اہتمام کیجیے، نہیں ہے تو ترک کر دیجیے، یہ آدھا تیتر آدھا بٹیر نہیں چل سکتا۔

۷۔ اصل قرآن میں آیات پر غور کی دعوت توحید یا دینِ حق کے سلسلے میں دلائل دیتے ہوئے دی گئی ہے اور اس غور سے مطلوب یہ ہے کہ لوگ کائنات پر غور کر کے اس کی بات کی گواہی بہ سلسلۂ وجود و توحید باری تعالیٰ سمجھ سکیں۔

ظاہر ہے کہ اس غور و خوض یا مطالعہ و مشاہدہ سے ضمناً سائنسی اور ٹیکنالوجی کے علوم کی راہ بھی کھلتی ہے۔ کشتیِ نوحؑ اور زرہ سازیِ داؤد علیہ السلام سے لے کر ذوالقرنین کے بند بنانے اور دھاتیں پگھلا کر استعمال کرنے تک، نیز حضورؐ کے طریقِ خندق کو جنگ میں استعمال کرنے اور منجنیق کے بنے ہوئے قلعہ شکن آلات کو استعمال کرنے تک اسلام نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی خاصی ترغیب دلائی ہے۔

مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں سائنس میں بھی بہت پیش قدمی کی اور ٹیکنالوجی میں بھی۔ ہوا سے چلنے والی آب کش مشینیں تو دورِ فاروقی ہی میں استعمال کی گئیں۔ دراصل مسلمانوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی جو دیواریں اُٹھائی تھیں، بعد میں انہی کو یورپ والوں نے مکمل کیا اور اُن پر چھت ڈال کر عمارت بنائی۔ موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی دراصل مسلمانوں کے کیے ہوئے کام کی تکمیلی شکل ہے، جیسے کوئی شخص پودا لگا کر خود تو رخصت ہو جائے اور بعد والے اس کی آبیاری کر کے اس سے برگ و بار حاصل کریں۔

یہ خیال غلط ہے کہ جو اب کام شروع کرے گا وہ ہمیشہ پیچھے رہے گا۔ نوخیز قوتیں اگر کام کریں

تو موجودہ غالب قوتیں کسی بھی وقت مضمحل یا ختم ہوسکتی ہیں۔ پھر اس کام کو آگے لے کر وہی چلے گا جس میں پُرزور ذہنی حرکت ہوگی اور توانائی اور فعالیت ہوگی۔ جاپان مغرب والوں کے بعد اُٹھا، مگر جنگی تباہی کے باوجود وہ آج دوسروں کے پیش پیش ہے۔ مسلمانوں کی اصل مشکل یہ ہے کہ ابھی اُن کے اندر وہ ایمانی قوت پوری طرح برسرِ عمل نہیں ہے جو ساری توانائیوں کو جگا دیتی ہے۔

۸۔ مسلمانوں میں علوم کی ترقی سے اُس طرح کی خرابیاں پیدا نہیں ہوئیں۔ جیسی آج کل کے مغربی معاشروں میں ہیں، کیونکہ اُن کا بنیادی مزاج خدا پرستانہ اور اخلاق پسندانہ تھا۔ لیکن پھر بھی ایمانی قوت کے مضمحل ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے اسبابِ زوال پیدا ہوتے گئے جنہوں نے ڈینیوب سے مالنگا تک چھائی ہوئی عظیم قوت کو پچھاڑ دیا۔

۹۔ لفظ روحانی سے اگر ذہن خانقاہیت کی طرف جائے تو آپ روحانی ترقی کے بجائے ایمانی و اخلاقی ترقی کی اصطلاح استعمال کریں۔ ترتیب بالکل اُلٹی ہے، یعنی ایمانی و اخلاقی ترقی مسلمانوں کے لیے مادی ترقی کا ذریعہ بنتی ہے۔ دعوت کے لیے جدید سے جدید وسائل کی ضرورت ہے، انقلاب کے لیے وسائل کی ضرورت ہے، حکومت کو چلانے کے لیے مادی قوتوں کی ضرورت ہے اور جنگ کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مادی اسباب کی ضرورت ہے۔

تاریخ کا تجربہ یہی ہے کہ قوموں کی قوتیں برسوں خوابیدہ رہتی ہیں، بلکہ کبھی صدیوں تک یہاں تک کہ اُن میں روحانی و ایمانی حرکت پیدا ہو اور وہ اتنا زور پکڑے کہ تحریکی درجے تک پہنچ جائے — ایمانی حرکت سے جو کشمکش پیدا ہوتی ہے وہ دماغی اور فکری قوتوں کو اُبھار دیتی ہے۔

دورِ حاضر کے مادی نظاموں کے پیچھے بھی ایک طرح کے اعتقادی اور اخلاقی رجحانات کارفرما رہتے ہیں، کسی نے مساوات اور جمہوریت کے نام پر پکارا، کسی نے معاشی برابری کی طرف، بعض فلسفے انتقامی ردِعمل میں نمودار ہوئے مگر اُن کے لیڈروں نے اُن کو قانونِ عدل کے تحت رکھ کر ان میں اخلاقی اپیل پیدا کی۔ افسوس ہے کہ میں مختلف مثالیں نہ تفصیل سے دے سکتا ہوں، نہ تجزیہ کر کے دکھا سکتا ہوں کہ میرے نقطۂ نظر سے ہر باطل نظام نے بھی ایک طرح کی اعتقادی اور اخلاقی اپیل اختیار کی، تبھی اُس کی دعوت انسانوں میں حرکت پیدا کر سکی۔

اسلامی حکومت کا کام جہاں نماز و زکوٰۃ کے نظام کو جامع شکل میں جاری کرنا ہے، وہاں وہ

تشکیل بھی ایسے انسانوں کی مساعی سے باقی ہے جو نماز و زکوٰۃ کے پابند ہوں۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ آیا حکومت یکسر ایک مادی قوت کا نام ہے۔ وہ انسانی فلاح کا ایک ادارہ ہے جس کے زیرِ تصرف مادی وسائل بھی ہوتے ہیں، مگر ایمانی و اخلاقی قوتوں کے زور سے ظہور کرتی اور خود اُن قوتوں کو مزید نشوونما دیتا ہے۔

۱۱۔ جدید انسان اور اسلام کے درمیان اختلاف بس اتنا ہی ہے کہ اسلام خدا پرست، عاقبت اندیش اور پابندِ اخلاق انسان پیدا کرنا چاہتا ہے، مگر جدید انسان ایک ملحدانہ و مادہ پرستانہ تہذیب کا حامل ہے، اُخروی جواب دہی کا کوئی احساس اُس کے اندر نہیں اور وہ اخلاق کو مادیت کے تابع کرنے کی وجہ سے لا اخلاقیت کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

۱۲۔ جدیدیت اور اسلام میں معروضی طور پر وہ بڑا فاصلہ حائل ہے جس کی طرف نمبر ۱۱ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ فاصلہ ہی نہیں، تضاد اتنا شدید ہے کہ نتیجہ تصادم ہے۔ یہ الگ بات کہ ہم تھوڑی قوت (قوتِ نظریہ و اعتقاد، قوتِ اخلاص، قوتِ اخلاق، قوتِ شعور، قوتِ اتحاد، قوتِ علوم و فنون اور قوت ادارات و وسائل) سے زیادہ بڑی قوت کے خلاف معرکہ آرائی میں مدت سے چوٹیں کھا رہے ہیں۔ مگر یہ بھی ہماری طرف سے حیرت انگیز کارنامہ ہے کہ غلامی میں پسنے اور شدید تہذیبی یورش کے وار سہنے کے باوجود کسی مرحلے میں ہتھیار ڈالنے پر تیار نہیں ہوئے۔ بخلاف اس کے اس بیسویں صدی میں تو ہمارے اندر سے نئے ایمانی شعور کے ساتھ ایسی قوتیں اُٹھ کر تیزی سے بڑھ رہی ہیں جو شاید جدیدیت کے مورچوں پر اسلام کی فتح کا جھنڈا لہرانے کی سعادت حاصل کر لیں گی۔

ہاں، تعصب بہر حال ہمارے اندر نہیں ہونا چاہیے۔ دورِ جدید کے علوم و افکار یا وسائل و ادارات میں اگر کچھ ایسی مفید چیزیں ملیں جو اسلام کے نظامِ فکر و تہذیب سے ہم آہنگی پیدا کر سکیں، تو اُن کو ضرور اخذ کیا جائے، مگر ہم اس مسحوریت اور مرعوبیت کے سخت خلاف ہوں جو حقیقتاً ذہنی شکست خوردگی ہے اور جس کے تحت ہمارے متجددین دورِ جدید کے سمجھے سوچے نظاموں کو اُٹھا کر اُن پر اسلام کا لیبل لگا دیتے ہیں اور اس مشغلے میں اسلام کے اصول و احکام پر دل کھول کر عملِ مسخ و تحریف کرتے ہیں۔

اگر جدیدیت کی یہ اہمیت ہے کہ اسلام کو اس کے قریب پہنچا دیا جائے تو آخر دورِ نبوت میں

رائج مشرکانہ نظامِ جاہلیت کی ہو؛ اہمیت کیوں نہ تھی کہ تصادم سے بچنے کے لیے اسلام کو اس کے قریب کر دیا جاتا، جیسے کہ مشرکین کا مطالبہ بھی تھا کہ کچھ نئی قسم کی وحی آنی چاہیے اور اسلام میں کچھ رد و بدل ہو جانا چاہیے۔

اسلام کی راہ اگر باطل نظاموں سے سمجھوتے کی راہ ہوتی تو تاریخ کے وہ سارے معرکے عمل میں نہ آتے جو ہر نبی اور ہر مردِ صالح کو کسی غلط نظام کی وجہ سے پیش آئے۔ ہمارا کام اسلام کو بدلنے کے بجائے زمانے کو یا ماحول کو بدلنا ہے، چاہے دیر لگے اور مشقت پیش آئے۔

۱۳۔ کچھ بات تو نمبر ۶ میں آ چکی ہے۔ مزید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک فاسد تہذیب کے غلبے نے جدید عورت کو جن حوصلوں اور توقعات سے آراستہ کر دیا ہے، وہ معیارِ فیصلہ نہیں ہیں۔ جدید دولت پرستوں کے حوصلے، جدید ادیبوں کے حوصلے، جدید ایکٹروں کے حوصلے، جدید کاروباریوں کے حوصلے اور جدید دولت پرستوں اور اسراف پسندوں اور تبذیر کیشوں کے حوصلے ——— یہ سب طرح طرح کے حوصلے مادہ پرستانہ طرزِ فکر سے پیدا ہوتے ہیں۔

اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ یہ صرف اُن لوگوں کا دین ہے جو رضا کارانہ جذبے سے اسے اپنے لیے پسند کریں، رضا کارانہ جذبے سے اس کے اصول و احکام کا اتباع کریں، اور معیارِ فیصلہ اسلام سے باہر تلاش کرنے کے بجائے اسلام کے اندر تلاش کریں۔ یہ تو سرِ تسلیم خم کر دینے والوں کا مسلکِ حیات ہے۔ اُن کا نہیں جو کسی دوسرے مورچے سے اسلام کے خلاف لڑیں اور اس کے اُصول و احکام کے اجزا اور ریشے الگ الگ کر کے پھر اُن میں پیوند کاری کریں۔

معتدل راہ مسلم خواتین کے لیے وہی ہو سکتی ہے جسے نمبر ۶ میں عرض کیا گیا ہے۔

جو کچھ میرے ذہن میں تھا، مختصراً آپ کے سوالوں کے جواب میں عرض کر دیا ہے۔ آپ ان گذارشات پر غور کریں۔

مطبوعات

عظمتِ صحابہؓ و اہلِ بیتؓ تالیف: شاہ اسمٰعیل شہیدؒ۔ ناشر: مکتبہ نذیریہ۔ جامع مسجد قبا، جناب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ صفحات: ۱۲۸ — قیمت: ۱۰/- روپے

دینی حقائق، خصوصاً احادیث نیز قرآن و حدیث کے علمی مفہوم کے ہم تک پہنچنے کا واحد، جامع اور مستند ذریعہ صحابہ و صحابیات (رضوان اللہ علیہم اجمعین) ہیں جن میں خلفائے راشدین، اہل بیت، ازواج مطہراتؓ، عشرہ مبشرہ اور شرکائے بدر و اُحد اور دیگر تمام غزوات کے مجاہدین اور شہداء اوّلین صفوں میں ہیں۔ حضورؐ کے صحابہؓ پر اگر کسی بدنصیب کو اعتماد نہ رہے تو پھر وہ دین کی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ اسی ضرورت کے تحت سلف سے خلف تک صحابہؓ کے سوانح اور فضائل پر دفتر کے دفتر لکھے گئے ہیں۔

یہ رسالہ جو شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "تذکیر الاخوان" کی چوتھی فصل پر مشتمل ہے، اس میں قرآن و حدیث کے شواہد کے آئینے میں خلفائے راشدین، حضرت طلحہؓ و زبیرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عباسؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت حسنؓ و حسینؓ، نیز اصحابِ بدر اور اصحابِ حدیبیہ کی عظمتوں کی جھلک پیش کی گئی ہے۔

ایک جامع تمہیدی باب حضرت شاہ اسماعیلؒ شہید کے مقام کو واضح کرتا ہے۔

"قم" سے آمدہ پمفلٹ منتلف منشورات فی طریق الحق۔ ناشر: اصول الدین پبلیکیشنز۔ پتہ قم، ص، ب، ۵ — ایران۔

کہا نہیں جاسکتا کہ یہ بیلٹی کا یہ سلسلہ سرکاری اہتمام سے ہے یا غیر سرکاری۔ ہمارے سامنے ایک ترعربی کے تین رسائل ہیں: ۱۔ ۲ یہود وتحت یفہم للادیان۔ ۲۔ التطبیق یکذب الماركسیة ۳۔ فشل الماركسیه۔ (یعنی یہ لٹریچر یہود اور مارکسزم کے خلاف ہے۔

دوسرے دو رسائل انگریزی میں ہیں۔ ایک ہے امام دوازدہم (THE TWELFTH AMAM) اس میں شیعی عقیدۂ امامت کے مطابق امام کے غائب ہوجانے اور وقت مقررہ تک زندہ غائب رہنے کا بیان ہے۔ ان کی غیر معمولی طویل زندگی کے حق میں جدید سائنسی تصورات سے استدلال کیا گیا ہے، حالانکہ جس امر کو روحانی و معجزاتی مانا جارہا ہو اُسے مادی سائنس کے تابع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

حالیہ تبدیلی جو واقع ہوئی ہے اس کا کوئی ذکر نہیں، یعنی امام معصوم کے ظہور سے پہلے کے دور میں امامتِ فقیہ کی بنیاد پر حکومت قائم کرکے جمہوری طریق سے چلائی جاسکتی ہے۔ الجماعت یعنی جمہوریت و شورائیت کا تصور اہل سنت کے یہاں کارفرما رہا ہے۔ اب عملی ضرورت نے ہمارے شیعہ بھائیوں کو بھی اسی روش کے اختیار کرنے پر مجبور کردیا ہے۔

دوسرا پمفلٹ مختصر تاریخ سقیفہ (A BRIEF HISTORY OF SAQIFAH) کے نام سے ہے۔ اس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ سقیفہ (بنو ساعدہ) کی کارروائی حضرت علیؓ کے خلاف ایک سازش تھی۔ تفصیل میں جائے بغیر ہم تین باتیں غور و فکر کے لیے سامنے رکھتے ہیں:۔ ایک یہ کہ حضرت علیؓ نے سیاسی پیمانے کا ردِ عمل نہیں دکھایا، جبکہ امام حسینؓ اپنے دور میں زیادہ شدید مزاحمت کے باوجود کم تر قوت کے سامنے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے، دوسرے یہ کہ عوام کی طرف سے بھی کوئی اہم سیاسی اضطراب سامنے نہیں آیا، اور تیسرے یہ کہ خلیفہ بننے والوں نے اُمت کی خیر خواہی کا حق ادا کرکے اور اپنے آپ کو مفاد اور ترجیحات سے محروم رکھ کر ثابت کردیا کہ وہ واقعی حضورؐ کی تربیت سے منصب خلافت کو سنبھالنے کے لیے پوری طرح فیض یافتہ تھے۔

اس سلسلے میں انقلابیانِ ایران سے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ ماضی کی بحثوں کو (س) اُٹھانے کے بجائے ایک نئے کشادہ ذہن کے ساتھ آگے بڑھیں۔ اور ایسا راستہ اختیار کریں کہ شیعہ سنی تمام جھگڑے

بھول بھلا کر خوش دلی سے مل ملا کر چلیں۔ تفرقہ پسند واعظوں اور مصنفوں کے بنائے ہوئے تنگ دائرے سے نکلیں۔ اور ایسا ہمہ گیر پیغام دیں کہ ساری دنیا کے مسلمان کھلے دل سے مستفید ہوں۔

خلفائے راشدین کی یگانگت مؤلف: منشی عبدالرحمٰن خاں۔ ناشر: صدیقی ٹرسٹ، نسیم پلازا، نشتر روڈ کراچی۔ ۱۷۶ صفحات مجلد مع گردپوش۔ قیمت: ۲۴/ روپے۔

نہایت اچھے موضوع پر نہایت اچھی کتاب ہے۔

دورِ خلافتِ راشدہ میں خواص و عوام کی سطح پر اس سوال کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی کہ افضلیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل تھی۔ اور کسی سازشی عمل سے ان کو راستے سے ہٹا کر دوسرے لوگ خلافت پر قابض ہو گئے۔ نیز اس وجہ سے اکابر صحابہ میں نزاع یا انقطاع کی صورتِ حال کبھی پیدا ہوئی۔ نہ یہ بحث کہ کون سی بیعت ٹھیک تھی اور کون سی غلط۔ اکابر صحابہ — خلفائے راشدین نے شروع سے آخر تک مل کر کام کیا، اُن کے درمیان گہرے قرابتی رشتے بھی تھے، اُن کی محبت کے بہت سے مظاہر تاریخ میں محفوظ ہیں، وہ ایک دوسرے سے مشورہ لیتے اور تعاون کرتے تھے۔ یہ تو بعد میں جب مجوسی یہودی سازشوں کا سلسلہ چلا تو عقیدوں اور تصورات اور اصطلاحات کا ایک جال عبداللہ بن سبا نے بھی پھیلایا جس میں دورِ فتنہ کے حواس باختہ مسلمانوں کا ایک گروہ اُلجھ گیا۔ اس گروہ کا اوّلین ظہور آخری اور چوتھے دورِ خلافت میں ہوا اور حضرت علیؓ کی نگاہ میں یہ گروہ ویسا ہی تھا جیسے خوارج کا گروہ۔ بلکہ خوارج کی نے حضرت علیؓ کو جتنا پریشان کیا، اُس سے زیادہ تنگ اُن کو اُس گروہ نے کیا جو بظاہر اُن کا محب بن کے اُٹھا۔ سبائی سازش نے نبوت کے تصور کو بدل دیا۔ امامتِ معصومین کا ایک نیا منصب پیدا کیا۔ قرآن کو نامکمل قرار دیا، حدیث کے الگ دفاتر بنوا دیے، تاریخ الگ لکھوائی۔ ماتم اور تقیہ اور تبرّا کو شریعت میں داخل کیا۔ اور مسلمانوں میں ایسا تفرقہ ڈالا کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ملّتِ اسلامیہ کی قوتِ وحدت کا شیرازہ پراگندہ چلا آ رہا ہے۔

منشی عبدالرحمٰن خاں نے یہ کتاب لکھ کر دین کی بڑی خدمت کی ہے اور اتحادِ اسلامی کے لیے فکری بنیاد مضبوط کر دی ہیں۔ انہوں نے واقعات اور حوالے جمع کر کے حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہؓ کے تعلقِ اخوت و تعاون کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ دیانتداری سے سوچنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

خوبصورت قاعدہ (اردو) مرتبین: حفظ الرحمٰن احسن ایم اے و بیگم نعیم ارشد ایم۔ اے۔ ناشر: صباح الادب و ایوانِ ادب۔ چوک اردو بازار لاہور۔ اچھے کاغذ پر رنگین طباعت قیمت ۵۰/۴ روپے

کوئی شک نہیں کہ یہ ایک اچھا قاعدہ ہے اور محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ مرتبین علمی و ادبی حیثیت سے ایک مقام رکھتے ہیں۔ میرا نقطۂ نظر لسانیات کے تعلیمی اصولوں کے علاوہ قاعدہ خوان بچے کی نفسیات پر مبنی ہے۔ حروف شناسی کے لیے ابتداءً جو تصاویر دی گئی ہیں، ان میں سے بعض کو تبدیل کر دینا چاہیے مثلاً "ح سے حج" کے لیے کعبہ کی تصویر کا مسئلہ قابلِ غور ہے۔ کیونکہ حج ایک سلسلۂ اعمال کا نام ہے — "ژ سے ژالہ" کی تصویر میں نمایاں چیزیں تو مرغابیاں اور لم ڈھینگ ہے۔ "ش سے شمع" میں بچے کے لیے شمع کا لفظ بھاری ہے۔ اور اس کا تلفظ خاصا مشکل ہے۔ "ص سے صبح" کی تصویر میں نمایاں چیز سورج ہے۔ اور یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ ڈوبتا ہوا سورج ہے یا ابھرتا ہوا۔ "ض سے ضیا" میں ضیا کا لفظ عام فہم نہیں۔ "ن سے نشانہ" میں چونکہ نشانہ کوئی ٹھوس شے نہیں بلکہ ایک عمل یا حالت کا نام ہے، اس لیے یہ بھی ابجد خوان بچے کے لیے مناسب نہیں۔ "ی سے یاقوت" میں ایک ایسی چیز کا ذکر ہے جس سے بچہ روزمرہ زندگی میں واقف نہیں ہوتا۔ اور یومِ یادگارِ پاکستان کے تو الفاظ خاصے بھاری ہیں۔ لاہور کے بچے یا ٹیلی وژن دیکھنے والے بچے تو شاید یادگارِ پاکستان سے واقف ہوں گے۔ مگر "یوم یادگار" کا تصور کم ہی کو ہوگا۔

امید ہے کہ ان دیانتدارانہ مشوروں کی روشنی میں آئندہ ایڈیشن میں تبدیلیاں کر دی جائیں گی۔

اردو کی خوبصورت کتاب (اوّل) مرتبین و ناشرین متذکرہ بالا۔ قیمت: ۵۰/۴ روپے

اس کتاب اول کی ترتیب میں بھی مرتبین نے بساط بھر محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور اس درجے کی کئی دوسری کتابوں سے یہ کتاب بہتر ہے۔ لیکن میں چھوٹے بچوں کے متعلق اپنے سوچے سمجھے نظریے کے تحت حسب ذیل مشورے دیتا ہوں۔

۱۔ عام سادہ حروف کو جوڑنے کی ساری حرکات بیان کرنے تک تین چیزیں ملحوظ کرنی چاہئیں۔ ایک دو چشمی ھ کے ساتھ بننے والے مرکب الاصوات حروف، دوسرے مشدد حروف، تیسرے نون غنہ والے حروف۔

۲ — بیشتر اسباق کے اوپر جو سہ حرفی اور چار حرفی الفاظ دیے گئے ہیں، وہ بدلتی ہوئی حرکات کے ساتھ ملے جلے آتے ہیں۔ حالانکہ بہتر صورت یہ ہے کہ ایک سبق میں زبر والے، دوسرے میں زیر والے، تیسرے میں پیش والے الفاظ دینے کے بعد چوتھے میں اُن کو مخلوط کر دیا جاتا۔

۳ — تعارفی سبق میں نون غنہ کے ساتھ سہ حرفی الفاظ مثلاً ماں، مَیں، ہیں وغیرہ میں چار حرفی کو یکجا نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً کہاں، لیکن، نہیں وغیرہ۔ پہلے سہ حرفی دیں، پھر چار حرفی دیں۔ ان میں سے مختلف حرکات والے الفاظ کو الگ الگ دیں۔ بعد میں جمع کریں۔

۴ - جس طرح سبق نمبر ۱۴ میں تشدید والے الفاظ کی آوازوں کو الگ الگ پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح سبق نمبر ۱۵ میں ہونا چاہیے۔ مثلاً محمّد صلی اللہ علیہ وسلم کی آوازوں کو یوں واضح کیا جائے۔ مُ، حَمْ، مَد

۵ - پہلی کتاب میں احترام اور معروف جیسے الفاظ نہ دیے جائیں تو اچھا ہے۔

ان گزارشات سے قطع نظر کرکے کہنا چاہیے کہ اردو کی یہ کتاب اوّل خاصی اچھی ہے۔ باتصویر ہے، کاغذ اچھا ہے اور کتابت و طباعت خوب ہے۔

خطباتِ یورپ | مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بعض افکار کا مجموعہ۔ مرتب: اختر حجازی۔ ناشر ادارہ ترجمان القرآن لاہور۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت ۴۲ روپے۔

یہ کتاب بہت اچھے کاغذ پر خوبصورت طباعت سے سامنے آئی ہے اور مولانا مودودیؒ کے افکار کو پھیلانے کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے مندرجات سے اصل مولف کا کام تو نہ کسی تحسین کا محتاج اور نہ کسی تنقید کا محتاج۔ مگر مرتب کی کمزوری یہ ہے کہ وہ تقاریر، بیانات، خطوط اور انٹرویو جیسی متفرق چیزوں کو جمع کرکے مجموعے کو صحیح نام نہیں دے سکے۔ خطباتِ یورپ کا نام مغالطہ انگیز ہے اور بعض لوگوں کو واقعی مغالطہ ہوا۔ مولانا مودودیؒ کی تحریروں اور تقریروں پہ کام کرنے والوں کو خاص احتیاط کرنی چاہیے کہ وہ قارئین کے لئے کوئی مغالطہ پیدا نہ ہونے دیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کے مندرجات زیادہ تر ایسے ہیں جو مغرب، مغربی علوم و تہذیب، اہلِ مغرب کے اکثریتی مذہب اور مغرب میں رہنے والے مسلمانوں سے متعلق ہیں اور ان موضوعات پہ یہ مجموعہ بہت مفید مواد مطالعہ ہمارے سامنے لاتا ہے۔

(بقیہ اشارات) موجود ہوتیں، فائیل ہوتے اور اُن کے بل پر تکنیکی راہیں واضح ہو جاتیں، اور ہر خادمِ تحریکِ اسلامی اُن کا مطالعہ کر کے اپنی مشکلات کو حل کر سکتا۔ سابق نقوشِ قدم جو کچھ ہیں، کم سے کم ان کا ریکارڈ مرتب ہو جائے جو بیرونی اشاعت کے لیے نہ ہو، صرف تربیت کا روں کے ذریعے اس سے حاصل شدہ نتائج پیش کیے جاتے رہیں تو یہ بھی بڑا کام ہے۔ ورنہ کام کرنے والوں کو اس عزم سے کام کرنا چاہیے کہ وہ خود تازہ تر نقوشِ راہ بنائیں گے اور اپنے نو بہ نو تجربات کا ریکارڈ مرتب کریں گے۔

ایک بہت بڑا قضیہ اس فرقہ بندی کا ہے جو تفرذ پردازی کی آخری حد تک جا کر نہ صرف یہ کہ مسلمان کو عمومی اتحاد پیدا نہیں کرنے دیتی، بلکہ صحیح اور جامع دعوتِ حق کے راستے میں بُری طرح حائل ہوتی ہے۔ اِس سے آگے بڑھ کر وہ اب سیاسی میدان میں بھی مسلمانوں کو متحدہ صف بندی کر کے اسلامی نظام کے قیام اور اسلامی قیادت کو بروئے کار لانے کا معرکہ سر کرنے کے قابل نہیں رہنے دینا چاہتی۔

اس مسئلے پر پھر کبھی اظہارِ خیال کروں گا۔ وبیداللہ التوفیق۔

احتیاط

ترجمان القرآن بہ ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں، اُن کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

تحریکِ اسلامی کے مراحل

از: سید اسعد گیلانی

- اسلامی تحریکوں کی قوت کا سرچشمہ کیا ہوتا ہے۔
- تحریکوں میں انفرادی اور اجتماعی امراض کون سے پیدا ہو سکتے ہیں
- تحریکی امراض سے بچنے کی تدابیر کیا ہوتی ہیں
- دعوت کا نور فہم کی روشنی اور جذبے کی توانائی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے
- تحریک کا قافلۂ سخت جان منزلِ مقصود تک پہنچنے کیلئے کن کن مراحل سے گزرتا ہے۔
- دورِ حاضر میں اسلامی تحریکوں کے لیے کامیابی کا راستہ کون سا ہے
- فکر کی روشنی اور عمل کی بیداری کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔

اسی نوعیت کے تربیتی موضوعات اس کتاب میں زیرِ بحث ہیں

تحریکی کارکنوں کیلئے تربیت اخلاق و کردار کی بہترین گائیڈ بک

ضخامت: ۱۶۰ صفحات، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت -/۱۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

علماءِ دین! — علماءِ طب — بنئیے!!

اور

ایک باعزت، موثر اور مفید — "ذریعہ معاش" جو

دینی خدمات کو موثر اور ان کے دائرہ کو وسیع کرنے کا ذریعہ

بھی ہے — اس سے بہرہ ور ہو جائیے!

— اَلحَمدُ لِلّٰہ —

کہ پاکستان میں دینی مدارس کی اسناد کو طبی تعلیم کے لیے بنیادی صلاحیت تسلیم

کر لیا گیا ہے — اور

جامعہ طبیہ اسلامیہ فیصل آباد

نے یہ فیصلہ کیا کہ دینی مدارس کے فاضل اور تا دورہ یا موقوف علیہ سے فارغ ذہین طلبہ — کو ترجیحی بنیاد پر قبول کیا جائے اور ان میں سے مستحق حضرات کو فیس وغیرہ میں خصوصی رعایت کا مستحق بھی قرار دیا جائے۔ درخواستیں بلاتاخیر مع نقول اسناد اور مدرسہ کے مہتمم صاحب کی جانب سے سیرت و اخلاق کی توثیق کے ساتھ درج ذیل پتہ پر پہنچ جانا چاہیئیں۔

(پہلے درخواست پہلے داخلہ کا اصول بھی ملحوظ رہے گا)

عبدالرحیم اشرف — ۳۷۵ جناح کالونی فیصل آباد